لالہ نبیسڈی داس

عرشیاں را صبح عید آں ساعتے ۔ چوں شود بیدار چشم ملتے

پاکستان

اور

ہندوستان

وقت کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مقبول تحریک کے متعلق ایک مستند کتاب

مرتبہ

عبدالقدوس ہاشمی

ناشر
ملنے کا پتہ

دارالاشاعت سیاسیہ (مجلس اتحاد المسلمین)

شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن

قیمت مجلد دو روپیہ ۸ ر

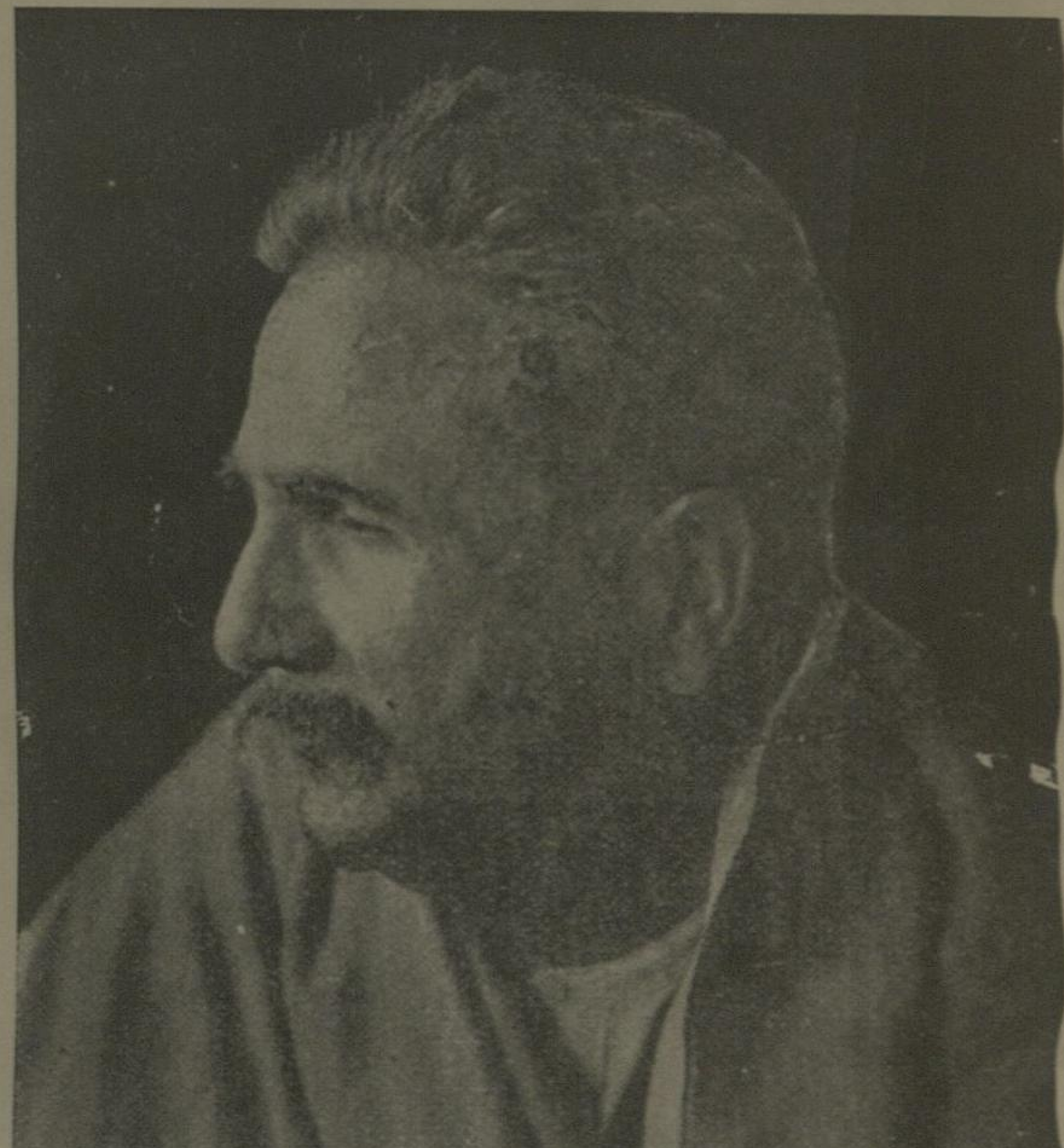
بارِ اوّل چار ہزار

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز

چار مینار حیدرآباد دکن



حکیم الاسلام حضرت اقبال رح

خدا آن ملتے را سروری داد ؎ کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بہ آن ملت سروکارے نداد ؎ کہ دہقانش برائے دیگران کشت

(اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

فہرس مضامین

تجاویز

اعتراضات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

ہر روز آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو دنیا میں نئے نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے اور ہر شام جب ڈوبتا ہے تو قوموں کے سامنے نئی نئی ضروریات کا ایک انبار غور و فکر کیلئے چھوڑ جاتا ہے، دنیا میں صرف وہی قومیں ترقی کر سکتی ہیں جو اپنی روایات و تاریخ کے ساتھ ساتھ ان تمام تحریکوں سے کما حقہ، واقف رہ کر جد و جہد میں مشغول رہیں جو ان کی حیات قومی پر اچھا یا برا اثر ڈال سکتی ہیں۔ یہ واقفیت اور جد و جہد دوسری قوموں کے لئے اگر ضروری ہے تو مسلمانوں کیلئے فرض عین کہنا چاہئے۔

اسلام انسانی حیات اجتماعی کا وہ سب سے بڑا حلقہ ہے جسمیں داخل ہو جانے کی اجازت کرۂ ارضی پر بسنے والے تمام بنی نوع انسان کو حاصل ہے، سیاہ و سفید روسی و ایرانی، اور کوئی چمار سے لیکر برہمن تک ہر شخص جب اور جس وقت چاہے اس حلقۂ اجتماع میں داخل ہو سکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وسیع معنوں میں انسانیت کا احساس جب کم نگاہی کی تعمیر کردہ نسل وطن اور رنگ کی چار دیواریوں کو توڑ دیتا ہے تو اسلامی اجتماع پیدا ہو جاتا ہے۔

اسلام، خدا کا ازلی و ابدی قانون، جب اس قدر وسیع اور عظیم الشان نظریہ اجتماع کا حامل ہے، اور جب ہر مسلمان اس نظریہ کا دنیا میں مبلغ ہے تو ذرا غور فرمائیے کہ اسکی دماغی تربیت پر کس قدر توجہ کی جانی چاہئے، کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اس مسئلہ سے اسے واقف کیا جائے، جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہو، اخباروں اور رسالوں میں مختلف اہل فکر حضرات کے مضامین اور تقریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، لیکن کون ہے جو ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں سے وہ فائدہ اٹھائے جو ایک مسلسل اور مربوط مجموعہ سے اٹھایا جا سکتا ہے اس مقصد کو سامنے رکھ کر مسلمانان دکن کی واحد قومی جماعت مجلس اتحاد المسلمین نے ایک دار الاشاعت سیاسیہ قائم کیا۔

اس دار الاشاعت کو دوام اور استحکام بخشنے کے لئے اس کا چندہ سے بے نیاز رکھنا ضروری تھا اس لئے اسے ایک خالص تجارتی ادارہ کی شکل دی گئی اسطرح انشاء اللہ یہ ادارہ عام اہل ذوق کی امداد سے آئندہ ایک مضبوط اور مستحکم دار الاشاعت کی خدمت انجام دیتا رہے گا۔

پاکستان اور ہندوستان

مسلمانان ہندوستان کے سامنے۔ اس وقت سب سے اہم اور سب سے بڑی جو تحریک ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آئندہ مسلمانوں کا دستوری موقف کیا ہو، کیا اس پورے جزیرہ نما کی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رہکر مسلمان دوسروں کی معاشی

دست برد کا شکار بنے رہیں یا اقوام و ممالک کے اس مجموعہ میں جسے آج "برطانوی ہند" کہا جاتا ہے مسلمانوں کو ایسے علاقہ حاصل کرنا چاہیئے جہاں ان کو آسمانی نظریہ اجتماع کے تحت زندگی بسر کر کے اپنی دینی و دنیاوی فلاح حاصل کرنے کا موقع مل سکے، اس تحریک کو "تحریک پاکستان کہتے ہیں"۔ آپ نے اس کے متعلق اب تک بہت سے مضامین پڑھے ہوں گے، اور بہت سی تقریریں بھی سنی ہونگی، لفظ "پاکستان" کی شہرت سے فائدہ اٹھانے والے بہت سے ناشرین نے چھوٹے بڑے رسالے اور نشریات بھی آپ کے سامنے اس نام سے پیش کئے ہونگے، لیکن اب بھی اس تحریک کی بہت سی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے آپ بےچین ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ قابل سند مفکرین کے مستند بیانات جو اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈال سکیں، آپ کے سامنے پیش کئے جائیں۔ تحریک پر جو مختلف قسم کے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے تشفی بخش جوابات آپ ملاحظہ فرمائیں، ہندوستان میں کئی قومیں آباد ہیں، اس کا ثبوت اس طرح پیش کیا جائے کہ کسی قسم کا ریب و شک باقی نہ رہے آپ پاکستان کے سلسلہ میں وہ غیر متعلق ولاطائل تحریرین دیکھنا نہیں چاہتے جو اس نام کے رسالوں میں نظر آتی ہیں۔

یہ ہیں وہ ضروریات جن کو پیش نظر رکھ کر آج ہم دارالاشاعت سیاسیہ کی سب سے پہلی کتاب "پاکستان اور هندوستان" آپ کے سامنے

پیش کر رہے۔ اور ہم مسرور ہیں کہ ہم نے اس لفظ کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف اصل مقصد کو سامنے رکھا ہے فاضل مرتب نے ایک حرف بھی کہین ایسا نہیں لکھا جو مسئلہ سے براہ راست تعلق نہ رکھتا ہو، اور مسئلہ کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جسے کتاب میں پوری طرح نمایاں کر کے پیش نہ کیا گیا ہو۔

آئندہ دارالاشاعت سیاسیہ کے پروگرام میں اسلامی سیاسیات اور مسائل حاضرہ سے متعلق کتابوں کا ایک سلسلہ داخل ہے، ہم نے جس طرح سامان طباعت خصوصاً کاغذ کی اس گرانی میں بھی اتنی عمدہ اور ایسی نفیس چھپی ہوئی کتاب "پاکستان اور ہندوستان" کی قیمت کم سے کم رکھی ہے، اسی طرح انشاءاللہ آئندہ بھی مسائل حاضرہ پر عمدہ اور نفیس کتابیں ویدہ زیب کتابت وطباعت کے باوجود کم سے کم داموں میں اہل ذوق کے لئے مہیا کرتے رہیں گے۔

دعوت و درخواست اس سلسلہ میں ہم اہل علم و اہل فکر کو تعاون کی دعوت دیتے ہیں

ہم چاہتے ہیں کہ مشاہیر علم و سیاست اپنے گرانقدر مشورون سے ہماری امداد فرمائیں۔ اور بتائیں کہ ہمین آئندہ کس قسم کی کتابین شائع کرنی چاہئیں اور وہ ہماری اس سلسلہ میں کیا امداد فرمائیں گے۔

اسی طرح کتاب "پاکستان اور ہندوستان" کے متعلق ہم آپ کی گرانقدر رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں جناب والا کی رائے کو سامنے رکھا جائے۔

شکریہ ہمارا خوشگوار فریضہ ہے کہ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر صدر مجلس اتحاد المسلمین کا شکریہ ادا کریں۔ جن کی غیر معمولی توجہ سے یہ "دارالاشاعت سیاسیہ" وجود میں آسکا، اور جن کے درد بھرے دل نے وقت کی اس ضرورت کا احساس کر کے ہم کارکنوں کو بھی اس مقصد کے حصول کی طرف متوجہ کر دیا۔

اسی طرح ہم مولانا سید عبد القدوس صاحب ہاشمی کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ہماری درخواست پر کتاب "پاکستان اور ہندوستان" کی ترتیب و تیاری کا کام نہایت خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ موصوف نے انگریزی زبان سے بہت سا مواد اکٹھا کرنے کے علاوہ خود اپنے قلم سے بھی کتاب کے اہم ترین ابواب پر پوری کتاب کا بڑا حصہ تحریر فرمایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر موصوف کی عالمانہ امداد ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اتنی جلد ہم اس قدر قیمتی کتاب ناظرین کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ جزاھما اللہ خیراً۔

سید علی شبر حاتمی بی۔ایس سی عثمانیہ — محمد اقبال سلیم گاہندری

انتساب

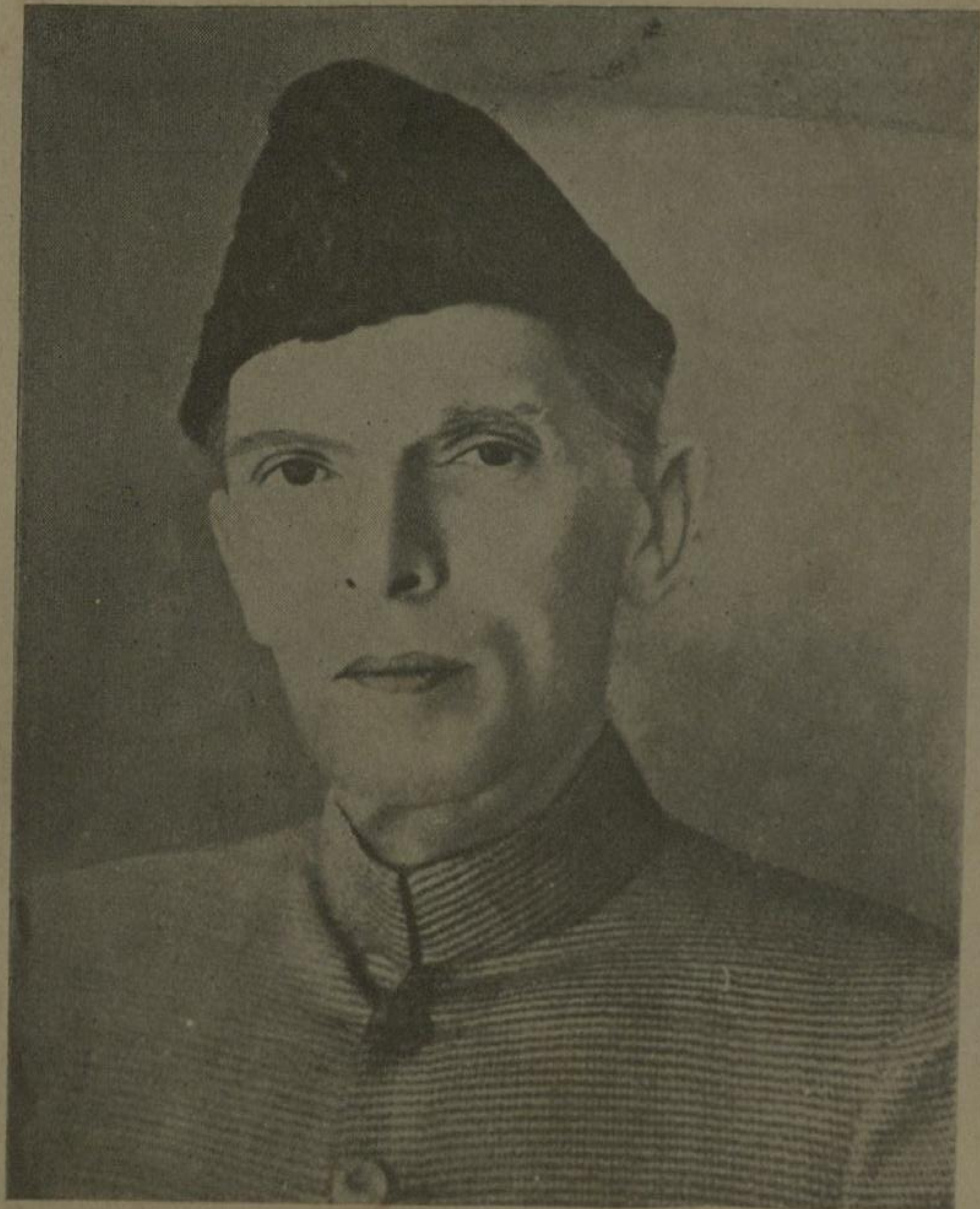
حکیم الاسلام اقبال کے نام

عقیدت کیش

عبدالقدوس ہاشمی



قاید ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر



قاید اعظم مسٹر محمدؐ علی جناح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہان نو

گفتند جہان ما آیا بتومی سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اس کرۂ ارضی پر بسنے والے انسانوں کی ذہنیتیں جس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح ان کے اجتماعوں کی ذہنیتیں بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انسانوں کے ہر گروہ کی ذہنیت یکساں ہو۔ اور سب کا خط فکر ایک ہی قرار پائے۔ بہت سی قومیں

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

پر عمل کرتی ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن کے اجتماعی قوانین نے زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دیا وہ خود اپنے قوانین کو بدل کر زمانہ کے موافق بنا رہے ہیں۔ جن کے یہاں ایک مرتبہ منسلک ہو جانے کے بعد عورت مرنے پر، بلکہ مرنے کے بعد بھی شوہر سے الگ نہیں ہو سکتی تھی، وہ طلاق کے قوانین اسمبلیوں میں بیٹھ کر پاس کر دیتے ہیں۔ اور جن کے یہاں

خدا کے ملنے کی سبیل ہی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ انسان ترک دنیا کرکے جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی بسر کرے، وہ اپنے مقتدایان مذہب کے لئے نہ صرف دارالامراء میں جگہ پیدا کر دیتے ہیں بلکہ دنیاوی ترک و احتشام کا وہ سامان مہیا کرتے ہیں جنھیں دیکھ کر بڑے سے بڑے دنیا پرست کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔

لیکن اسلام دین فطرت ہے اس لئے وہ بنی نوع انسان کے لئے ایسا قانون نہیں پیش کرتا جو فطرت انسانی کا ساتھ نہ دے سکے۔ یہی فرق ہے، آسمانی قانون اور زمینی ضابطہ میں، زمینی ضابطہ کا مرتب بنی نوع انسان کو اس طرح نہیں پہچان سکتا جس طرح خود فاطر ارض وسما جانتا ہے، اس لئے اس کے بنائے ہوئے ضوابط وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، لیکن وہ جس نے انسانوں کو بنایا ہے اور ماضی حال و مستقبل جس کے سامنے ایک ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ جب انسانوں کو اپنا سرمدی ولاہوتی قانون عطا فرماتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ تم زمانہ کی ہوا کے ساتھ بدلتے رہنا، وہ جانتا ہے کہ جب کبھی زمانہ اس قانون کا ساتھ نہ دے سکے گا وہ وقت اہل زمانہ کی گمراہی اور طغیان کا ہوگا، اس وقت جو انسان اس قانون کو اپنے لئے دنیاوی و اخروی زندگی کا سرمایہ بنائیں گے۔ انھیں

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز — نہیں

بلکہ — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

پر عمل کرنا چاہئے، اور کوشش کرنی چاہئے کہ زمانہ اس کے موافق ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ انھوں نے بھی طاغوتی قوتوں کے آگے سر جھکا دیا تو ان میں اور دوسرے باطل پرستوں میں کیا فرق رہ گیا؟ اور کیوں نہ دنیا میں قیامت برپا کر دی جائے۔ اگر زمین پر بسنے والے انسانوں میں کوئی قوم اپنے پیدا کرنے والے کا قانون اپنے اوپر جاری کرنا نہیں چاہتی تو آخر یہ زمین و آسمان باغیوں کی پناہ گاہ اور خالق اکبر سے جنگ کرنے والوں کا اڈا بنا کر کیوں قائم رکھے جائیں۔ یاد رکھئے جس دن دنیا میں کوئی انسان ایسا باقی نہ رہے گا جو آسمانی قانون کے آگے سر جھکا دے وہ دن قیامت کا دن ہوگا۔

مسلمانوں نے کبھی اہل زمانہ کے اہوا و طغیان کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ابو جہل اور ابو لہب کا مطالبہ اس کے سوا کیا تھا، کہ ساری دنیا جس طرح چل رہی ہے، اسی طرح چلو، نئی باتیں پیدا نہ کرو، قریش کی فضیلت سب مانتے ہیں تم بھی مانو، بلال کو ان کا ہمسر نہ بناؤ۔ عرب و عجم کو ایک کرنے کی کوشش نہ کرو۔ لیکن کیا صحابہ کرام نے کسی وقت "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر عمل کیا؟ نعوذ باللہ اگر وہ زمانہ سازی کرتے تو خدا کا قانون اس کی زمین پر کبھی نہ جاری ہوتا۔ عہد صحابہ کے بعد لوگ ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہو گئے، او

درباریت و زمانہ سازی کی ابتدا ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ شوق جہاد سرد پڑ گیا۔ ملوکیت پر دینداری کا رنگ چڑھایا گیا۔ اور مسلمانوں کو ملوکیت کے صنم اکبر کے لئے اللہ کا نام لے کر گڑ ایا گیا۔ لیکن ان درباریوں سے قطع نظر کر لیجئے تو عامتہ المسلمین میں خدا سے بغاوت پیدا نہ ہوئی تھی اور اہلِ حق کا ایک نہ ایک گروہ ہمیشہ ملوکیت کے بت سے بھی تیشہ کار رہا۔ اسے آپ پہلی صدی میں دیکھ سکتے ہیں اور چودھویں صدی میں بھی۔ آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ زمانہ سازوں کی اس بھری ہوئی دنیا میں ایک گروہ، ایک جماعت اور ایک قوم ایسی ہے جو اہل زمانہ کی گمراہیوں میں ان کا ساتھ دینا نہیں چاہتی، جو نہیں چاہتی کہ اس پر روسو کا نظریہ تمدن یا افلاطون کا نظریہ حکومت جاری کیا جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس پر اُس کے خدا کا بنا ہوا قانون جاری ہو۔

مذہب کا مفہوم مذہب کا مفہوم اس زمانہ میں صرف اس قدر ہے کہ جب انسان اپنے دنیاوی کاروبار اور تمدنی ضروریات سے فارغ ہو جائے تو کچھ دیر کے لئے اپنے پروردگار سے لو لگا لے۔ جس طریقہ پر چاہے اسے یاد کرے ایسا کرنے سے اسے قلب میں طمانیت اور اس کی روح کو ایک قسم کا سکون محسوس ہوگا۔ ملکہ وکٹوریہ نے جب ۱۸۵۸ء میں ہندوستانیوں کو مذہبی آزادی عطا فرمائی تھی تو

اس کا یہی مقصود تھا، اور کانگریس نے جب کراچی میں مذہبی آزادی کی تجویز منظور کی تو اس سے بھی یہی مراد تھی۔ کسی غیر مسلم کے لئے مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کسی مادرزاد اندھے کے لئے اس کیفیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں جو خوب صورت پھولوں، اور سرسبز کیاریوں کے نظارہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم کسی ایسے مذہب کا تصور ہی نہیں کر سکتا جو انسانی اعمال و افکار پر محیط ہو، جس کی گیرائی سے نہ کوئی تجارتی معاملہ باہر ہو، اور نہ کوئی نجی، مذہب کس طرح پیدائش سے موت تک ایک مسلمان کی زندگی پر طاری رہتا ہے یہ امر کسی غیر مسلم کے سمجھنے کی چیز نہیں، یہی وجہ ہے کہ اسے ہماری بے چینی ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے دوسروں کی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنا کیوں مشکل ہے۔ جب انھیں مسجدوں میں نماز پڑھنے اور اذان کہنے کی اجازت حاصل ہے تو پھر انھیں مذہبی آزادی کے حاصل نہ ہونے کی شکایت کیوں ہے۔ اُن کو کون دکھائے جن کو آنکھیں عطا ہوئی ہیں، مگر دیکھتے نہیں، انھیں کون سنائے جنھیں کان ملے ہیں مگر سنتے نہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ زمانہ کا ساتھ دو، اقوام اوطان سے بنتی ہیں، مذاہب سے نہیں بنتیں۔ اس پورے جزیرہ نمائے ہند کے تمام باشندے

ایک قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم کے دو اجزاء ہیں، ہندوستان میں یورپ کی اصطلاحی قومیت پیدا کرو، اور مذہب کو ایک پرائیوٹ معاملہ رکھو، اس طرح حق قانون سازی، اور پھر اس قانون کے نفاذ کا حق بھی اس مزعومہ قوم کی اُس اکثریت کو دیدو جس کا مذہب ہمارے مذہب سے مختلف، جس کا دماغ ہمارے دماغ سے مختلف، جس کا دل ہمارے دل سے مختلف اور جس کے اعمال و افکار ہمارے اعمال و افکار سے مختلف ہیں۔ اس طرح زمانہ سازی کی ہمیں تعلیم دیجاتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر جس نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے، شاہد ہے کہ مسلمان کی فطرت اس تعلیم سے بغاوت کرتی ہے۔ وہ کبھی نہیں تسلیم کرسکتا کہ ایسی قومیت اس کے لئے سازگار ہوسکتی ہے انسان ہونے میں یقیناً ساری دنیا کے انسان ہمارے ساتھ شریک ہیں، لیکن عصفور کا گھونسلہ شہباز کے لئے موت کا مقام ہوگا۔ وہ اس آرام دہ گھونسلہ میں بھی دو منٹ چین سے بسر نہیں کرسکتا۔

مسلمان ایسی صورت حال کے مقابلہ میں "با زمانہ ستیز" پر عمل پیرا نہ ہو تو اور کیا کرے۔ شہباز عصفور کو گھونسلہ بنانے میں مدد دے کر اس میں زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہ موت کو ایسی

زندگی پر ہزار درجہ ترجیح دے گا۔ مسلمان کے لئے بھی اس جزیرہ نما میں صرف ایک صورت زندہ رہنے کی ہے، وہ یہ کہ اپنے لئے ایک "جہان نو" تعمیر کرے اگر یہ نہ کر سکا تو اس مزعومہ ہندوستان میں جس کے لئے اہل زمانہ اسے تیار کرنا چاہتے ہیں زندہ رہنے سے اس کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

دفاعی قومیت

ایک بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اعمال و افکار کے بالکل متغائر و متخالف ہونے کے باوجود ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک "دفاعی قومیت" تعمیر کر لیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ ہر "دفاعی قومیت" دفاع کے بعد فوراً ہی "ہجومی قومیت" میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس تبدیلی کے لئے وہ اپنے کمزور اجزاء کو اس طرح پیس دیتی ہے جیسے ابراہام لنکن امریکن پریسیڈنٹ نے جنوبی امریکہ والوں کو پیس کر رکھ دیا تھا اور جب اس طرح قومی وحدت قائم ہو جاتی ہے تو یہی قومیت دوسروں کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آنکھوں سے اس "دفاعی قومیت" کے ہجومی نتائج یورپ میں دیکھے اور لکھتے ہیں کہ

"عالمگیر جنگ یورپ اس نظام قومیت کی نامرادی کا

سب سے بڑا اعلان تھا، ۵ سال تک خون اور آگ میں
رہ کر جب دنیا نے دوبارہ سنبھالا لیا تو زندگی اور امن
کی جستجو از سر نو شروع ہو گئی۔ ان تمام لوگوں نے جن کی
ذہنیت کسی قومی نظام حکومت کی غرض پرستیوں سے آلودہ
نہ تھی محسوس کر لیا کہ پچھلا نظام اب دنیا کو زیادہ عرصہ تک
مطمئن نہیں رکھ سکتا۔" (رسالہ اسلام اور قومیت مصنفہ مولانا
آزاد ص۴۷ طبع ۱۹۴۰ء)

متماثل عناصر سے ترکیب پانے والی "دفاعی قومیت" جو
امریکہ اور فرانس میں بنی اس کا تو یہ حال ہے، اب اگر خدانخواستہ
غیر متماثل عناصر سے جیسا کہ ہندوستان کی مختلف قومیں اور نسلیں
ہیں، کوئی دفاعی قومیت بن بھی گئی تو اس کے دردناک نتائج کا
اندازہ کون لگا سکتا ہے افسوس یہ کہ خود مولانا ابوالکلام کو بھی
وہ وقت نظر نہیں آ رہا ہے جبکہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال
دینے میں یہ دفاعی قومیت کامیاب ہو چکے گی۔ اور ایک دوامی
اکثریت ہندوستان میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گی۔ اُس
وقت ہندوستان کتنی سخت خانہ جنگی کا شکار ہوگا اور کیا اُس وقت
نئی حاصل شدہ آزادی کا برقرار رکھنا ایک مشکل کام نہیں ہو جائیگا؟

آئندہ کا ہندوستان چاہے درجہ مستعمرات رکھتا ہو، یا آزاد خود مختار حکومت ہو، اگر سارے جزیرہ نما کی ایک مرکزی حکومت ہوئی تو اس مرکز میں لازماً ہندوؤں کی اکثریت ہوگی، دنیا کا کوئی دماغ کسی مجلس میں مسائل کے فیصلہ کی اس کے سوا کوئی شکل پیدا نہیں کر سکتا کہ آراء کی کثرت و قلت فیصلہ کُن قرار دی جائے، اس کے بعد بہت آسانی سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر وہ قانون جس کو ہندو پاس کرنا چاہے گا مسلمانوں کے اختلاف کے باوجود، آسانی سے پاس ہو جائے گا۔ اور ہر وہ قانون جسے مسلمان پاس کرنا چاہے گا ہندوؤں کے اختلاف سے نامنظور ہو جائے گا۔ یہ اکثریت و اقلیت دوامی اکثریت و اقلیت ہوگی۔ اس صورت میں اگر مسلمان اپنی اس حیثیت پر قانع ہو گیا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اور پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ سرحدی مسلمان جو ۹۶ فیصد آبادی رکھتا ہے کیوں اس حالت میں رہنا گوارا کرے گا۔ کوئی مولانا ابوالکلام اور کوئی گاندھی جی یہ بتائیں کہ اس کا نتیجہ مسلمانوں کی تباہی اور ملک میں ایک مہیب خانہ جنگی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اگر مسلمان اس کشمکش میں ہندوؤں سے جن کے ہاتھوں میں اُس وقت سارے ملک کی دولت، اور تمام فوج و ذرائع موجود ہوں گے کسی طرح جیت بھی گئے تو کیا ہندو اس حالت کو اپنے لئے موت

نہ سمجھے گا۔ کیا اس پر راضی ہو جائے گا کہ سی۔ پی میں جہاں اس کی عظیم الشان اکثریت ہے مسلمانوں کا فوجی قبضہ ہمیشہ قائم رہے اور کیا یہ مہیب خانہ جنگی ان دونوں میں سے کسی ایک کی تباہی پر ختم نہ ہو گی؟

موجودہ اختلاف

اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں نہ مسلمان اور ہندو ملکر مرکزی حکومت کو چلائیں، مجھے ذرا بے تکلف اور انتہائی یقین کے ساتھ کہنے دیجئے کہ جب تک مسلمان، مسلمان اور ہندو، ہندو ہے یہ امر بالکل ناممکن ہے، اور نہ صرف میرے نزدیک ناممکن ہے بلکہ گاندھی جی کے نزدیک بھی اس کا کوئی امکان نہیں، ایک گاؤکشی کے مسئلہ پر جو اختلاف دونوں قوموں میں ہے وہ ظاہر ہے، مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ یہ ایک "رخصت" ہے لیکن جب مسلمان کو اس کے مذہبی حق و رخصت سے بزور روکا جائے تو اس حق کی حفاظت فرض ہو جاتی ہے اب ذرا گاندھی جی کی زبان سے، ہندوؤں کے خیالات اس مسئلہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یوروپین کے لئے گاؤکشی جاری رہنے کے بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دبا ہوا ہے جو انگریزی عملداری نے

پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں ہے۔ جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مذہب جیسا کہ میں جانتا ہوں۔ یہ اس کی روح کے سراسر خلاف ہے۔ وہ عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤکشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے اغماض نہیں کرے گا۔"

(گاندھی جی کا مضمون مطبوعہ اسٹیٹسمین کلکتہ مترجمہ در الفضل مورخہ ۹۔ مارچ ۱۹۱۸ء)۔

یہ تو تھے عام ہندوؤں کے خیالات اب ذرا خود گاندھی جی کے خیالات اس مسئلہ پر ملاحظہ فرمائیے۔ ہری پور کانگریس کے موقع پر بالکل واضح الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"کسی نہ کسی طرح بذریعہ قانون گاؤکشی بند کی جائیگی"۔

خود گاندھی جی کو اس امر کا کتنا خیال ہے آپ زیر نظر عبارت سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"یہ سطور میں بقرعید کے دن لکھ رہا ہوں جو مسلمانوں کے لئے خوشی کا دن ہے اور ہندوؤں کے لئے غم کا، کیونکہ مسلمان گائے کی قربانی کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ گائے

ہندوؤں کے لئے مذہبی عبادت کی چیز ہے"۔

(انڈین نیشن مورخہ ۵ ۳/۲۷ء)

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تصفیہ ممکن ہے، اور کیا محمد علی سی آر داس پیکٹ کا حشر آپ کے سامنے نہیں ہے؟

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں کانگرس کا اجلاس کراچی میں ہو رہا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں صدر جلسہ سے استدعا کرتے ہیں کہ نماز کے لئے چند منٹ جلسہ کی کارروائی ملتوی کر دی جائے۔ مگر یہ درخواست ٹھکرا دی جاتی ہے لیکن گاندھی جی کی پرارتھنا کے لئے اجلاس تو کیا ساری دنیا کے کاروبار روک دیئے جا سکتے ہیں، اور پوری شان کے ساتھ کھلے میدان میں گاندھی جی پرارتھنا کرتے ہیں، ہزارہا انسان اس میں شریک ہوتے ہیں۔

اسلام محض ایک اخلاقی ضابطہ نہیں بلکہ مکمل نظام زندگی ہے، مسلمانوں کے جملہ امور حیات، معاشی ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا مذہبی، تمدنی ہوں، یا عمرانی تمام کے تمام ایک قانون الٰہی ایک ضابطہ خداوندی کے ماتحت سرانجام پاتے ہیں۔ اسی نظام زندگی کا نام ہے! اسلام ایسے مذہب کو منظم مذہب (Organized Religion) کہتے ہیں اسلام

مسلمہ طور پر ایک منظم مذہب ہے۔ ذرا اپنے اس اسلام کے متعلق جواہر لال نہرو کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کا آرزومند ہوں۔"

(میری کہانی از جواہر لال نہرو ص ۱۶۱)

ماضی عام طور سے یہ خیال جاتا ہے کہ شاید مغل دور حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوش گوار تھے، تاریخ کا تفصیلی مطالعہ اس کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ ابھی آپ نے گاندھی جی کا مضمون پڑھا ہے کہ

"ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دبا ہوا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔"

بالکل اسی طرح مغل دور میں اس خوف کے نیچے دبا ہوا تھا جو مغل عملداری نے پیدا کر دیا تھا، ورنہ جہاں کہیں انھیں موقع مل جاتا تھا یہ باز نہ آتے تھے، فرشتہ اور خافی خاں نے اپنی تاریخوں میں ایسے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے جہاں مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی، اور مسلمانوں کو دردناک

مظالم کا شکار بنایا گیا ہے، مثال کے طور پر دو واقعے نقل کرتا ہوں، مشہور مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"یہ لوگ (ہندو) مسجدوں میں گھس جاتے اور باجے بجاتے، جس وقت بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بیحد رنج ہوا مگر چونکہ اس میں ان افعال کے روکنے کی قوت نہ تھی اس لئے ایسا ظاہر کرتا کہ گویا اسے اطلاع ہی نہیں ملی"۔

عبدالحمید لاہوری نے شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ۔

"جس وقت شہنشاہ گجرات (پنجاب) میں پہنچا، بعض سادات نے شکایت کی کہ ہندوؤں نے زبردستی مسلمان عورتوں کو گھر میں ڈال لیا ہے اور مسجدوں کو مکان بنا کر ان میں رہتے ہیں۔ شیخ محمد گجراتی ایک مقامی عالم کو تحقیقات کا حکم ہوا۔ تب مسلمان عورتیں تحقیقات کر کے چھڑائی گئیں، اور جن مساجد پر قبضہ کا ثبوت ملا اسے واپس لیا گیا، شہنشاہ نے حکم دیا کہ جہاں کہیں ایسے واقعات پیش آئیں مناسب تدارک کیا جائے"۔

یہ صرف دو واقعات ہیں جنھیں میں نے مثال کے طور پر درج کر دیا ہے، خدانخواستہ کسی کی ذہنیت اور برتاؤ کا مکمل نقشہ کھینچنا مقصود نہیں ہے۔ ورنہ شاید فہرست اس چھوٹی سی کتاب کی ضخامت سے زیادہ ہو جاتی

حقیقت یہ ہے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

نہ کبھی ماضی میں کفر و اسلام مشترک و محبت کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو سکے تھے، اور نہ حال میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیا مستقبل میں یہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو سکیں گے، اس کے لئے ماضی و حال کا تجربہ کافی ہے، اور اس تجربہ سے زیادہ محکم دلیل قرآنی حکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے لایألونکم خبالا وہ (غیر مسلم) تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہ رکھیں گے

قرآن کریم میں اس حقیقت کا بار بار انکشاف کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم کو ان سے بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔

مستقبل اب ذرا جائزہ لیجئے کہ خود کانگریس اور کانگریسی ہندو آئندہ کی ہندوستانی حکومت کیسی بنانا چاہتے ہیں، قرآن مجید کی صداقت آپ کو اس میں آفتاب کی طرح درخشاں نظر آئے گی۔ کانگریسی ذہنیت کا جائزہ لینے سے پہلے ان مسلمانوں کی زبان سے خطرات کے اندیشہ سنئے جو ہماری بدقسمتی سے آج خوش فہمی کے شکار ہیں۔ جمیعتہ العلماء کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب فرماتے ہیں۔

"اسلامی حکومت کے زوال پر اگر خدانخواستہ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی"

(اخبار الجمعیۃ دہلی بابتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۶ء ص ۷)۔

مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کو آئندہ کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے تاکید فرماتے ہیں۔

"نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہو جئے" (خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء ۱۹۲۱ء)

ہندوستان کا آئندہ مذہب

مستقبل کے ہندوستان کو ہندو کیسا بنانا چاہتے ہیں۔ اس کا تصور فرمائیے۔ ابھی آپ سن چکے ہیں کہ گاندھی جی کے قول کے بموجب گاؤکشی قانوناً ممنوع ہوگی، منظم مذہب جواہر لال کی تمنا کے بموجب صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ اگر مذہب کوئی باقی رہے گا تو اس کی وہ شکل ہوگی جس کی تعلیم بدنام عالم تعلیمی اسکیم میں دی گئی ہے اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس نے ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۲ر فروری ۳۹ء میں لکھا تھا، اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی غلط فہمی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عام لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ہر دو مذہب بلکہ تمام بڑے مذاہب اپنی اصولی باتوں (Essential) میں بالکل یکساں ہیں۔ اختلافات صرف جزئی باتوں میں ہیں جنھیں مولانا ابوالکلام آزاد فروع سے تعبیر کرتے ہیں"۔

...... اس مرض کا حتمی علاج یہ ہے کہ ان اصولوں کی تعلیم عام کر دی جائے جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں (اور اس کی عملی ترکیب یہ ہے کہ) کانگریسی وزارت کو چاہیے کہ ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کرے جو اس قسم کی نصاب کی کتابیں تیار کرے جن میں مشترکہ اصولوں کی تعلیم موجود ہو.......

.... اس کے ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام بچوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے کہ ہندوستان کے تمام موجودہ مسلمان اپنے ہندو آباء و اجداد کی اولاد ہیں اس لئے ہندو اور مسلمان دور یا نزدیک سے باہمی رشتہ دار ہیں'۔

...... میری مخلصانہ درخواست ہے کہ ان تمام کتابوں سے جنھیں عوام الناس مقدس صحائف مانتے ہیں ایک جدید مجموعہ تیار کیا جائے.... میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا

ہوں کہ اس "عالمگیر مذہب" کی مشترک کتاب کی تجویز میں نے اس سے پیشتر کئی ایک مواقع پر کی ہے"۔

اس اقتباس سے مستقبل کے ہندوستانی مذہب کا ایک خاکہ سامنے آگیا ہو گا۔ مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں! یہ ظاہر کر دینا البتہ ضروری ہے کہ یہ تجاویز ان ہندوؤں کی ہیں جو کانگریس کے کراچی والے مشہور رزولیوشن کے پابند ہیں، اور انہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر گاندھی جی نے واردھا کی مشہور تعلیمی اسکیم مرتب کرائی ہے (ملاحظہ ہو مقدمۂ واردھا تعلیمی اسکیم) ورنہ مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے اور ہمتھ ناتھ کرجی کے جیسے تو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

"آریوں کو چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رکھیں"۔ (رسالہ آریہ سماج ص۴)

اب ذرا مذہب کے سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کے ارشادات سنیئے۔

"ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریقہ پر آیا، بایں ہمہ ان ہر دو متضاد تصورات زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہو گیا، یہ سلسلہ گرونانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر

جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا۔ اکبر نے اس باہمی امتزاج کے لئے خاص طور پر کوشش کی، ہرچند کہ وہ اس بارے میں اپنی توقعات کے مطابق کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس سلسلہ میں تقدم کا سہرا اسی کے سر ہے، اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے ضرور بڑھتا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان میں آ پہنچی"۔

(اخبار لاٹ مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۳۹ء)

اس قدر تو جواہر لال جی نہرو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام اور ہندومت متضاد تصورات زندگی کے حامل ہیں، مگر وہ چاہتے ہیں کہ ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل جاری رہے یعنی وہ رَو جسے اکبر نے چلایا اور دارا شکوہ نے جسمیں مزید موجیں پیدا کی تھیں وہ آہستہ آہستہ آتش خاموش کی طرح پھیل رہی تھی اور قریب تھا کہ اسلام برہمو سماج کی شکل اختیار کرے، مگر انگریزوں کی آمد سے یہ سلسلہ رک گیا۔ اب چونکہ انگریز کی قوت کم ہو رہی ہے، اس لئے اس سلسلہ کو پھر وہیں سے شروع کر دینا چاہئے جہاں سے یہ سررشتہ ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ تاآنکہ واردھا تعلیمی اسکیم وغیرہ سے یہ کام تکمیل کو پہنچ جائے۔

متحدہ قومیت

متحدہ قومیت اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے مولانا ابوالکلام چاہے اسے "دفاعی قومیت" سے تعبیر کریں، اور مولانا حسین احمد چاہے "اس متحدہ قومیت" کے جتنے معانی لغات سے نکال کر بتائیں، لیکن اس "متحدہ قومیت" سے کانگریس کیا مراد لیتی ہے وہ مسٹر سیتامورتی کانگریس پارٹی کے لیڈر کی زبان سے سنئے مرکزی اسمبلی میں یہ سوال اٹھا کر محکمۂ ریلوے میں مسلمان ملازمین کی تعداد بہت کم ہے۔ کانگریس پارٹی نے جو "آرمی بل" پر شور مچاتی ہے کہ فوج میں مسلمان ۶۶ فی صدی کیوں ہیں، اور ہندوؤں کو آبادی کے تناسب سے فوجی ملازمتیں دے جانے پر زور دے رہی ہے، ریلوے میں مسلمان ملازموں کی تعداد کے مسئلہ پر غیر جانبدار رہتی ہے، اور اس کا لیڈر اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ :-

"میں چاہتا ہوں کہ یہ ایوان اپنے اندر قومیت کا جذبہ پیدا کرے جس سے مفہوم یہ ہے کہ وہ اول و آخر ہندوستانی ہیں، اور یہ اس وقت ہو سکے گا جب ہندو آہستہ آہستہ یہ بھول جائیں کہ وہ ہندو ہیں، اور مسلمان بھول جائیں کہ وہ مسلمان ہیں"۔

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۳۹ء)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ قومیت کا مفہوم کیا ہے۔ البتہ یہ بات آپ کو

عجیب معلوم ہوتی ہوگی کہ ہندو کو فوجی ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے حصہ دئے جانے پر اصرار کرنے والے اپنے ہندو ہونے کو نہ بھولے، لیکن شائد آپ کو یاد نہ رہا کہ اگر سارے جزیرہ نمائے ہند کی ایک مرکزی وحدانی حکومت ہوگی، جیسی اب ہے تو پارلیمنٹری طریقہ حکومت میں ہندوؤں کو زبردست اکثریت حاصل ہوگی، یہ بھی واضح رہے کہ اصول جمہوریت کے مطابق اکثریت کا ارادہ پوری قوم کا ارادہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اکثریت کی فرقہ پرستی عین قومیت ہے اور اقلیت کا مطالبۂ حق بدترین فرقہ پرستی۔ پنڈٹ جواہرلال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانحمری میں ایک سے زیادہ جگہ اس کی تصریح کردی ہے کہ "اکثریت کی فرقہ پرستی قوم پرستی سے قریب تر ہوتی ہے"۔

قومی رسم الخط یہ تو ہوا مذہب، تہذیب اور قومیت متحدہ کا نمونہ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ آئندہ ہندوستان کی زبان اور رسم الخط کانگریس کے نزدیک کیا ہونا چاہئے، رسم الخط کی اہمیت قوموں کی زندگی میں کیا ہے اور قومی ادبیات کا رسم الخط سے کیا تعلق ہے، یہ بھی پنڈت جواہرلال نہرو ہی سے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت بڑا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اُس زبان کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا

ماضی شاندار رہا ہو رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہی الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں، قدیم وجدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو"۔

(میری کہانی از جواہر لال نہرو جلد اول ص ۴۹۵)

یہ تو ہے رسم الخط کی اہمیت، اب گاندھی جی سے سنئے کہ ہندوستان کا عالمگیر رسم الخط کیا ہونا چاہئے۔ فرماتے ہیں:-

"میں نے پہلے ہی اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے کہ صرف دیوناگری ہی ایسا رسم الخط ہے جو ہندوستان میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔

(ہریجن مورخہ ۱۱ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء)

گاندھی جی کے اس منصوبہ پر ان کوششوں کا اضافہ فرمائیے جو دیوناگری رسم الخط کو جبراً رائج کرنے کے سلسلہ میں کانگریسی وزارتوں کی طرف سے کی گئیں، انشاء اللہ آئندہ کانگریسی ہندوستان کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔

ہم نے احتیاط کے ساتھ اس کی کوشش کی ہے کہ آپ کے

سامنے صرف ان ہندو اشخاص کے بیانات پیش کئے جائیں جو ہندوستان میں متحدہ قومیت کے معمار ہیں، ہندوؤں کی اس جماعت کو آپ کے سامنے نہیں پیش کیا گیا جو مہا سبھا سے متعلق ہے اگرچہ مقصد میں کانگریس اور مہا سبھا دونوں کا اتفاق ہے، مگر پھر بھی ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو کانگریس کے سمجھنے میں چھوٹی سے چھوٹی الجھن بھی واقع ہو، اس لئے ان ہی اشخاص کے بیانات دئے گئے ہیں جو ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت تعمیر کر کے ہندوستان کو آزاد کرانے کا دم بھرتے رہتے ہیں۔

آزادی

ذرا آزادی کو سمجھ لیجئے، آزادی کا لفظ جس قدر اس کا مفہوم اور مقصد گنجلک ہے، ضروری نہیں کہ آزادی کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک یکساں ہو۔ ایک قفس میں مرغابی اور شہباز دونوں کو بند کر دیجئے، غلامی میں دونوں شریک ہیں اور دونوں آزادی کے لئے برابر بے چین ہوں گے لیکن کیا آزادی سے دونوں کا مقصود ایک ہو سکتا ہے، اگر قفس سے نکال کر ان دونوں کو ایک ایسی جھیل کے کنارہ چھوڑ دیا جائے جس کے اوپر آہنی جال لگا ہوا ہو تو مرغابی کو آزادی مل گئی اور وہ آزادی مل گئی جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے لیکن شہباز سے پوچھے

کہ یہ آزادی اس کے لئے غلامی نہیں تو کیا ہے؟ وہ فضاءِ بسیط میں پرواز کرنا چاہتا ہے اور یہی اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔

اب ذرا موجودہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں پر غور کیجئے، کیا آزادی کا مفہوم اور نظریہ دونوں قوموں کے نزدیک بالکل جداگانہ نہیں ہے، دونوں آزادی چاہتے، دونوں انگریزوں کے غلام ہیں، دونوں اس غلامی سے نجات کے طالب ہیں، لیکن ہندو جس قسم کی آزادی چاہتا ہے، مسلمان اپنے لئے ایسی آزادی کو غلامی سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ آقاؤں کی تبدیلی سے اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

انگریز جس وقت ہندوستان میں آئے مسلمان صدیوں سے ملوکیت کے آہنی پنجوں میں گرفتار تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے لئے تیار نہ تھا کہ کسی خاندان کی غلامی سے نجات حاصل کر کے وہ ایک غیر مسلم قوم کا غلام ہو جائے، اس نے طرح طرح سے اس کی مخالفت کی باغی اور بقول ڈاکٹر ہنٹر کے مذہبی دیوانوں کا لقب اسے ملا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت کی بقا کے لئے اُتم جاتی کے ہندوؤں کی تربیت شروع کی مدتوں تک طرح طرح کی معاشی دستبرد ہندو گماشتوں کے ذریعہ مسلمانوں پر جاری رہی، یہاں تک

کہ بنگال کے تمام معاشی ذرائع مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر چیٹرجی، نبرجی اور مکرجی گھرانوں میں جا پہنچے، انگریزوں نے قوم اور قومیت کے یوروپین معانی ہندوؤں کو سکھا دیئے تھے، اب جب کہ مسلمانوں کے پاس کچھ نہ رہ گیا تھا تو ہندوؤں نے محسوس کیا کہ انگریز کی معاشی دستبرد کا لازمی اثر خود اس پر پڑنے والا ہے، اس وقت اس نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی، مسلمان کچلے جا چکے تھے اس لئے انھوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ حالانکہ جس قسم کی آزادی ہندو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کے کسی کام کی نہیں، حتیٰ کہ خود مولانا ابوالکلام آزاد جو ہماری بدقسمتی سے آج کانگریس کے صدر ہیں اس کی مخالفت فرمانے لگے، مولانا کا ارشاد ہے کہ:-

ہم اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے گورنمنٹ پر اعتماد دیا۔ ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت"۔

(مضامین مولانا آزاد حصہ سوم)

جمیعتہ العلماء کو جو آج کانگریس کے نقش قدم پر چلنا ضروری قرار دے رہی ہے اپنے اجلاس کلکتہ بابتہ ۱۹۲۶ء میں حسب ذیل تجویز کرنی پڑی۔

"چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے، اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بَل پر ملک کو آزاد کرائیں، البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد عمل کرنا چاہیں، ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا جائے۔"

یہ خلیج ۱۹۹۲ء سے اب تک وسیع ہوتی چلی گئی، جیسا کہ آپ نے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے گذشتہ بیانات سے اندازہ لگا لیا ہوگا۔

منتہائے نظر مسلمان کے لئے آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان میں وہ اپنی فطرت کے مطابق خدائی قانون کے ماتحت زندگی بسر کر سکے لیکن ہندو کے لئے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کو داخلی طور پر خود مختار تسلیم کر لیا جائے جہاں آبادی کی اکثریت کے نمائندوں کا بنایا ہوا قانون نافذ العمل ہو، رہا انگریز کو نکالنا سو ہندوؤں کے پیش نظر نہ کبھی تھا؛ اور نہ اب ہے گاندھی جی نے ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو جو خط سابرمتی سے حکومت ہند کے نام لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ:-

"اگر ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نو آبادیات) جس کا اعلان آپ نے

کیا ہے، اصل معنوں میں استعمال کیا جائے تو سوراج کے رزولیوشن سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ برطانوی مدبرین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈومینین اسٹیٹس بھی ایک قسم کی آزادی ہے لیکن مجھے جو اندیشہ ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ڈومینین اسٹیٹس دینے کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے"۔

۶، مارچ ۱۹۳۱ء کو امریکن اخبارات کے نمائندوں سے گاندھی جی نے "پورنا سوراجیہ" کے حسب ذیل معنی بیان کئے :-

"سوراج کے معنی ہیں اندرونی طور پر منظم حکومت اور پورنا کے معنی ہیں مکمل، کوئی صحیح لفظ نہ پاتے ہوئے ہم نے مکمل آزادی (Complete Independance) کے لفظ کو اس کے معنوں میں مجبوراً اختیار کر لیا ہے پورن سوراجیہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی بیرونی طاقت سے رابطہ نہ رکھا جائے پھر برطانیہ سے یہ رابطہ کیسے منقطع کیا جا سکتا ہے، یہ تو باہمی فائدہ کے لئے ہے"۔

یہ ہیں کانگریس کے نزدیک "پورن سوراجیہ" کے معنی، بلکہ اس سے بڑھ کر گاندھی جی برطانیہ اور ہندوستان کے ایک مشترک جھنڈے کے نیچے "پورن سوراجیہ" قبول کرنے کو بھی تیار ہیں (حوالہ سابق)۔

اوپر کے بیانات سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہندو صرف

معاشی آزادی" چاہتا ہے، اور وہی اس کا منتہائے نظر ہے، ہیئت حکومت وہ ایسی چاہتا ہے کہ آبادی کے ہر بالغ آدمی کو حق رائے دہی حاصل ہو، اس طرح منتخب شدہ جماعت کو ملک میں قانون بنانے اور چلانے کا موقع دے دیا جائے، اسی ضرورت کے لئے وہ ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال باقی نہ رہے وہ اپنے اس مقصد میں صوبجاتی خودمختاری کو حائل دیکھتا ہے، وہ دیکھ رہا ہے کہ اگر صوبجات کو اختیار حاصل ہوں گے تو ہندوستان کے پانچ صوبوں، پنجاب، سندھ[2]، سرحد[3]، بنگال[4] اور آسام[5] اور اسی طرح بلوچستان میں مرکزی اسمبلی کے قوانین آسانی سے جاری نہ ہو سکیں گے، دستور ۱۹۳۵ء کی اس نے اسی لئے مخالفت کی، اور جب کانگریس نے وزارت قبول کی تو ایک ہائی کمانڈ بنا کر وزرا کو منتخب کنندگان کی بجائے واردھا کے سامنے جواب دہ قرار دیا۔ اس طرح عملاً اس نے صوبہ جاتی خودمختاری کی اس قلیل مقدار کو بھی بے اثر بنا دیا جو ۱۹۳۵ء کے دستور ہند میں دی گئی تھی۔

مسلمان کی بے چینی

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "پورن سوراجیہ" حاصل ہو گیا۔ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر غور کیجیے کہ ہندوستان سے انگریز رخصت بھی ہو گئے تو ہندوستانی

مسلمان کو یہ مجوزہ حکومت مطمن کر سکے گی اور کیا آزادی کے اُس معنی میں جو مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے، مسلمانانِ ہند آزاد ہو جائیں گے، کیا اس وقت ایک ایسی قوم کی غلامی ان پر مسلط نہ ہوگی، جس کے ارادے آپ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سن چکے ہیں۔

کیا مسلمان اپنے اوپر خدائی قانون جاری کرنے کی کوشش کر سکینگے؟

کیا زکوٰۃ کی تنظیم کے لئے قانون بنا سکیں گے؟

کیا وہ مسلمان مجرموں کو شرعی سزا دے سکیں گے؟

کیا سود کی مصیبت سے قوم کو نجات دلانا ممکن ہوگا؟

کیا انگریزوں کی معاشی دست برد سے ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ہندوؤں کی معاشی دست برد سے مسلمان آزاد ہو سکیں گے؟

کیا مسلمانوں کو جبری فوجی خدمت کے لئے تیار کیا جا سکے گا؟

وغیرہ وغیرہ۔

ان سب سوالوں کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ سارے جزیرہ نمائے ہندوستان پر ایک مرکزی اسمبلی حکومت کرے گی۔ جس میں مسلمانوں کی آواز تناسب آبادی کے بموجب ۲۴ فیصد ہوگی،

اور کسی طرح یہ ممکن نہ ہوگا کہ ۶۰ فیصد کی مرضی کے خلاف کوئی قانون منظور ہو سکے۔

غور فرمائیے جب سارے جزیرہ نما کے بسنے والے مسلمانوں کی پوری نو کروڑ آبادی بھی اپنے لئے آپ فیصلہ کرنے کا حق نہ رکھے گی تو غلامی اس حالت کے سوا اور کون سی حالت ہے جس کا نام رکھا جائے۔ اور کیا سندھ کے ۷۵ فیصد، سرحد کے ۹۶ فیصد بنگال ۵۴ فیصد اور پنجاب کے ۵۶ فیصد مسلمانوں پر یہ انتہائی ظلم نہ ہوگا کہ انھیں اپنے لئے آپ قانون بنانے کے حق سے محروم کر کے تمام اہم معاملات کے متعلق قانون انھیں ایک مرکزی حکومت سے بنا کر دئے جائیں۔ اور ایسی مرکزی حکومت سے جس میں اُن کی آواز صرف ۲۴ فیصد ہو کر بالکل بے اثر ہو جائے۔

اس لئے مسلمانوں نے طے کیا ہے کہ اس جزیرہ نما میں ایک مرکزی حکومت نہیں بلکہ دو مرکزی حکومت قائم کی جائے۔ ایک ہندوستان کے لئے، اور دوسری پاکستان کے لئے۔ پاکستان کا لفظ مسلم صوبوں کے ناموں سے مرکب ہے، پ، پنجاب سے، ا۔ افغانی سرحد سے، ک، کشمیر سے، س۔ سندھ سے اور تان بلوچستان سے لے کر یہ لفظ بنایا گیا ہے، پاکستان کی مرکزی حکومت

کے ماتحت بنگال اور آسام بھی رہے گا۔ اس پورے مجموعہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۶۵ فیصد ہوگی اس طرح مسلمانوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے اوپر خدائی قانون جاری کر سکیں۔

باقی رہے وہ صوبے جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، وہ ایک مرکزی حکومت ہو یا دو صورت میں اقلیت میں رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کے لئے تحفظات حاصل کئے جائیں اور پاکستان کی مرکزی قوت کا دباؤ ان تحفظات کے روبہ عمل آنے کی ضمانت ہو۔

اس تقسیم سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ پاکستان کے غریب ہندو اور مسلمان باشندے ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی معاشی دست برد سے نجات پا جائیں گے، اور انھیں پیٹ بھر روٹی میسر آنے لگے گی، یاد رکھئے کہ معاشی دست برد سے نجات صرف قوت اور قانون کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ ورنہ محنت و مزدوری کرنے میں کسان سرمایہ داروں سے بہت آگے ہیں، لیکن دیکھئے کہ وہ کس طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جرمنوں نے یہودیوں کو جب تک جرمنی سے نکال نہ دیا ان کے دست برد سے نجات ممکن نہ ہو سکی اسی طرح جب تک قانوناً اس قسم کی دست برد کا سد باب نہ کیا جائے، سرحد اور پنجاب کے باشندے اسی طرح تباہ حال رہیں گے۔

تحریکِ پاکستان کی سرگذشت

دریائے گنگا و جمنا کے سنگھم پر الٰہ آباد میں شاہ عالم نے انگریزی کمپنی کے نام بنگال کی دیوانی کا پٹہ لکھا تھا۔ یہ پٹہ مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کے لئے موت کا فرمان تھا، حسن اتفاق دیکھئے کہ اسی الٰہ آباد میں ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ہندستان میں ایک "اسلامی ہند" کی تجویز پیش کی علامہ رحؒ کی بصیرت نے اس وقت نصب العین کو دیکھ لیا جب کہ سارا اسلامی ہند اس کے لئے بے چین تھا، لیکن پھر بھی اکثر لوگوں نے اسے صرف ایک شاعرانہ تخیل قرار دیا۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت ایسی ضرور پیدا ہوگئی جس نے اس مقصد کی تبلیغ شروع کر دی اس جماعت کے سرگروہ جناب چودھری رحمت علی صاحب تھے، انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ہندوستان و یورپ کو اس تحریک سے روشناس کرایا وہ وقتاً فوقتاً پمفلٹوں کے ذریعہ لوگوں تک اس آواز کو پہنچاتے رہے یہاں تک کہ یورپ کی دنیا بھی تحریک پاکستان سے واقف ہوگئی اس جگہ دو یورپین اخبارات کے اقتباسات

درج کئے جاتے ہیں۔

"چودھری رحمت علی جو پاکستان نیشنل تحریک کے صدر اور بانی ہیں، ایک پسندیدہ اور دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ طبعاً ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، وہ انگریزی نہایت روانی اور بے تکلفی سے بولتے ہیں، مگر ان کی فطرتی مناسبت زبردست جذبۂ وطنیت کی وجہ سے اپنی مادری زبان اُردو سے ہے جس کے ساتھ انھیں ایسی والہانہ محبت ہے کہ ہم میں اکثر لوگوں کو اپنی مادری زبان "آئرش" سے نہیں ہے وہ اس بے پناہ جذبۂ قومیت کے زبردست مبلغ ہیں جس بنیاد مذہب پر ہے" اپنے پاس اپنے دعوے کی تائید میں نہایت معقول دلائل ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ شمالی مغربی سرحد اور اس کے قریبی چار صوبوں پنجاب، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ملک بنا دیا جائے جو پاکستان کے نام سے موسوم ہو۔ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور اور نہ اس تنگ نظری کو روا رکھا جائے گا جس کی بدولت ہندوؤں نے چھ کروڑ اچھوت پیدا کردئے ہیں۔"

"چودھری صاحب کا لائحۂ عمل بالکل آئینی ہے اور وہ یہ تصور

نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی علیحدگی اور آزادی کے خلاف کیا اور کیوں اعتراضات کئے جا سکتے ہیں"۔

(اخبار ارٹش انڈی پنڈنٹ مورخہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

لندن کے مشہور ہفتہ وار جریدہ "گریٹ برٹین اینڈ دی ایسٹ" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک مضمون "ہندو مسلم مناقشات" پر شایع کیا جس کے بعض جملے حسب ذیل ہیں،

"یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان کے مابین کوئی موثر مفاہمت نہیں ہو سکی اور نہ آئندہ مفاہمت کی صورت پیدا ہونے کا کوئی امکان ہے۔ ایک ایسا بیان ہے جو سرتاپا ناقابل انکار حقائق پر مبنی ہے۔ اس المناک حقیقت کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر عائد ہوتی ہے جو اصل مسئلہ سے احمقانہ طور پر پہلو تہی کر رہے ہیں۔ ہم نے کسی ایک موقعہ پر بھی ہندو مسلم مسئلہ کو مستقل اور دائمی طور پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی...

"ان تنازعات کا اصلی سبب وہ بنیادی اختلافات ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں چاہے وہ شعبہ مذہبی وروحانی ہو یا تہذیبی و ثقافتی یا کوئی اور۔ ان کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ

ہر قوم کے لئے ہندوستان میں ایک قومی وطن مخصوص کردیا جائے"

"چونکہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب اکثریت رکھتے ہیں اس لئے وفاقی دستور حکومت (جس میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلم صوبے بھی داخل ہوں گے) غالب طور پر ہندوانہ ہوگا، یہ بالکل سچ ہے کہ فرقہ وارانہ ہنگامے اس وقت تک ہوتے رہیں گے جب تک کہ ہم اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جو ان قوموں کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے پاکستان وطنی تحریک کے جائز مطالبہ کو منظور نہ کرلیں، اس کے سوا دوسرا حل ممکن ہی نہیں اس لئے جتنا جلد اسے قبول کرلیا جائے اتنا ہی ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے لئے مفید ہوگا

اس طرح چھ سال بسر ہو گئے، عام طور سے مسلمان سائمن رپورٹ، فرقہ وارا عطیہ اور گول میز کانفرنس کے دوسرے نتائج میں اس طرح الجھے رہے کہ مسلمان زعماء کو اس تجویز کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی لیکن یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا، کہ مسلمان اس کے مخالف تھے یا اقلیت کا درجہ قبول کرلینے پر تیار رہتے ہیں مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو جو تاریخی خط مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیراعظم برطانیہ کو لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔

"ایک ایسی جماعت کو جو صرف ہندوستان میں سات کروڑ

نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی علٰحدگی اور آزادی کے خلاف کیا اور کیوں اعتراضات کیے جا سکتے ہیں"۔

(اخبار ائرش انڈی پنڈنٹ مورخہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

لندن کے مشہور ہفتہ وار جریدہ "گریٹ برٹن اینڈ دی ایسٹ" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک مضمون "ہندو مسلم مناقشات" پر شایع کیا جس کے بعض جملے حسب ذیل ہیں،

"یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان کے مابین کوئی موثر مفاہمت نہیں ہو سکی اور نہ آئندہ مفاہمت کی صورت پیدا ہونے کا کوئی امکان ہے۔ ایک ایسا بیان ہے جو سرتاپا ناقابل انکار حقائق پر مبنی ہے۔ اس المناک حقیقت کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر عائد ہوتی ہے جو اصل مسئلہ سے احمقانہ طور پر پہلو تہی کر رہے ہیں۔ ہم نے کسی ایک موقعہ پر بھی ہندو مسلم مسئلہ کو مستقل اور دائمی طور پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی...

"ان تنازعات کا اصلی سبب وہ بنیادی اختلافات ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں چاہے وہ شعبہ مذہبی و روحانی ہو یا تہذیبی و ثقافتی یا کوئی اور۔ ان کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ

ہر قوم کے لئے ہندوستان میں ایک قومی وطن مخصوص کر دیا جائے۔"

"چونکہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب اکثریت رکھتے ہیں اس لئے وفاقی دستورِ حکومت (جس میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلم صوبے بھی داخل ہوں گے) غالب طور پر ہندوانہ ہوگا، یہ بالکل سچ ہے کہ فرقہ وارانہ ہنگامے اس وقت تک ہوتے رہیں گے جب تک کہ ہم اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جو ان قوموں کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے پاکستان (وطنی تحریک) کے جائز مطالبہ کو منظور نہ کریں، اس کے سوا دوسرا حل ممکن ہی نہیں اس لئے جتنا جلد اسے قبول کر لیا جائے اتنا ہی ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے لئے مفید ہوگا"

اس طرح چھ سال بسر ہو گئے، عام طور سے مسلمان سائمن رپورٹ فرقہ وارانہ عطیہ اور گول میز کانفرنس کے دوسرے نتائج میں اس طرح الجھے رہے کہ مسلمان زعماء کو اس تجویز کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی لیکن یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا، کہ مسلمان اس کے مخالف تھے یا اقلیت کا درجہ قبول کر لینے پر تیار رتھے۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو جو تاریخی خط مسٹر ریمز سے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کو لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔

"ایک ایسی جماعت کو جو صرف ہندوستان میں سات کروڑ سے

زیادہ ہے، جینوا کی اصطلاح میں اقلیت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔
یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جماعت کے افراد دنیا میں چالیس کروڑ
سے بھی زیادہ ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بقیہ دنیا کو بھی اپنے طرز فکر اور اپنے
نظریہ حیات کیطرف لے آئیں یہ جماعت عمومی برادری کی قائل ہے اور نہ صرف
قائل بلکہ اس پر عامل بھی ہے، ایسی جماعت کو اقلیت کہنا بکواس نہیں تو اور کیا ہے؟"

آپ اس خط سے اندازہ لگا سکتے ہیں یوروپین سیاسیات کی اصطلاح میں مسلمانان ہند کو اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی معقول مسلمان مدبر کبھی تیار نہ تھا۔

سنہ ۱۹۳۵ء کا دستور سنہ ۱۹۳۷ء کے اپریل سے جاری ہوا۔ ترتیب وزارت میں معمولی سا اختلاف رونما ہوا، اور اقلیت و اکثریت کا فرق اس قدر نمایاں طور پر سامنے آ گیا کہ خواب غفلت سے مسلمان چونک پڑے، خواص سے لے کر عوام تک سب کی سمجھ میں آنے لگا۔ کہ جینوا کی اصطلاح میں اقلیت کسے کہتے ہیں، اور اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ اگرچہ جینوا کی اصطلاح میں اقلیت کا جو مفہوم ہے وہ مسلمانان ہندوستان پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ کیونکہ یورپ میں اقلیت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ملک کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھرے ہوئے ہوں کہ کسی جگہ سوسائٹی یا جماعت نہ بنا سکیں۔ لیکن انگریز

اپنی ہٹ دھرمی سے مسلمانوں کو اقلیت بنانے پر مصر تھے بلکہ ۱۹۳۵ء کے دستور میں اقلیت بنا چکے تھے۔ مسلمانوں کو یقین آگیا کہ اقلیت کا یہی درجہ ہے تو ہزار تحفظات کے بعد بھی ان کے لئے ہندوستان میں مسلمان رہ کر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس احساس کے ساتھ سارے ملک میں بے چینی پھیل گئی اور ہر شخص پریشانی کے عالم میں یہ سوچنے لگا کہ مسلمان کیا کریں؟ بعض مشہور اخبارات میں اس عنوان پر مسلسل مضامین نکلے، ان میں کانگریس کے دردناک مظالم کی طویل داستانوں کے علاوہ یہ سوال بھی آیا کہ مسلمان جب کسی مزعومہ قومیت کا جزیعنی ملک کی اقلیت نہیں ہیں تو جہاں ان کی آبادی زیادہ ہو، وہاں انھیں خود مختار و آزاد حکومت کا حق کیوں نہ ملے۔ یہ سوال تحریروں اور تقریروں میں بار بار دہرایا گیا، علامہ اقبال کی تجویز زندہ موجود تھی بلکہ اس آٹھ سال کی مدت میں بہت کچھ لوگوں کے کان اس سے آشنا بھی ہو چکے تھے، اس لئے مسلمان اس کی طرف بہ حیثیت جماعت متوجہ ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ نے ایک کمیٹی اس تجویز کی تفصیلات پر غور کرنے کے لئے مقرر کر دی؛ اس کمیٹی کے سامنے ملک کے ارباب فکر نے متعدد تفصیلی تجاویز پیش کیں جو اس کتاب کے حصہ "تجاویز"

میں درج ہیں۔ بالآخر ۲۲، ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور نے تفصیلات پر غور کرنے کا کام مجلس عاملہ کے سپرد کر کے "تقسیم ہند" کی تجویز منظور کر لی یہ تجویز اپنی اہمیت کی بنا پر اس کتاب میں الگ عنوان سے درج کر دی گئی ہے۔ اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ:۔

"مسلمانوں کی آبادی جزیرہ نمائے ہند کے جن حصوں میں زیادہ ہے ان حصوں کو حکومت خود اختیاری دیدی جائے اور پورے جزیرہ نما کے لئے کوئی ایک مرکزی حکومت کا تصور ختم کر دیا جائے۔ اس طرح جزیرۂ نمائے ہند کے دو مرکز قائم کئے جائیں۔ ایک "ہندو انڈیا" یا ہندوستان اور دوسرے "مسلم انڈیا" یا پاکستان، ان کو دفاعی، تجارتی، اندرونی و بیرونی ہر طرح کی آزادی حاصل ہو، پاکستان کے ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسی تحفظات دی جائیں جو ان کی انفرادیت کو قائم رکھ سکیں۔ اس طرح دو مرکزوں کی موجودگی میں دونوں قوموں کو ترقی کرنے کا موقع حاصل رہے گا، اور ان کا ایک دوسرے پر ایسا دباؤ پڑے گا کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر اور پاکستان میں ہندوؤں پر ظلم کرنا آسان نہ ہوگا۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کی اس تجویز کا اخبارات میں آنا تھا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے چیخ پکار کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور طرح طرح کے اعتراضات شروع ہوئے۔ ان کا تفصیلی ذکر آپ اس کتاب کے اس باب میں پڑھیں گے جہاں اعتراضات و جوابات درج ہیں۔

گاندھی جی کو شبہ ہو گیا تھا کہ یہ تجویز شائد عام مسلمانان ہند کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ صرف ان مسلمانوں نے اسے منظور کیا ہے جو اجلاس لاہور میں شریک تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس خطرہ کا اظہار ایک طویل مضمون میں کیا (ہندوستان ٹائمز دہلی، ۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء) قائداعظم محمد علی جناح نے گاندھی جی اور ان کی قوم کے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ۱۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو "یوم پاکستان" منانے کا حکم دیا۔ پورے جزیرہ نمائے ہندوستان میں اس تاریخ کو جلسے ہوئے۔ ایک ایک قصبہ و دیہات تک میں مسلمانوں نے اس تجویز کی تائید کی، ان ہزارہا جلسوں میں کسی ایک میں بھی اختلاف رائے پیدا نہ ہو سکا، تو آخر کار گاندھی جی نے لکھا کہ:۔

"اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان فی الواقع اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خطہ ارضی پر کوئی ایسی طاقت نہیں جو انھیں روک سکے۔ خواہ کتنا ہی تشدد آمیز یا عدم تشدد کے

ذریعہ اس کی مخالفت کی جائے!

(ہندوستان ٹائمز ۵ مئی ۱۹۴۰ء)

"یوم پاکستان" کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اکثر جگہ جلسوں میں غیر آریائی ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا خصوصاً احاطۂ مدراس میں ڈراویڈین لیڈروں نے تائید میں پرجوش تقریریں کیں، اور بتایا کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر آریائی ہندوؤں کو بھی اُتم جاتی کے ہندوؤں نے طرح طرح کے معاشی دست برد کا شکار بنا رکھا ہے، وہ اس طرح ان کو لوٹ رہے ہیں اور ایسی چالاکی سے انھیں تباہ کر رہے ہیں کہ جب تک ہندوستان کو مختلف آزاد حصوں میں تقسیم نہ کر دیا جائے نہ مسلمان نجات پا سکتے ہیں اور نہ ڈراویڈین۔ پرائی۔ وی راما سوامی لیڈر جسٹس پارٹی کی وہ تقریر جو موصوف نے سیلم میں "یوم پاکستان" کے موقع پر کی تھی، اس کتاب میں بعینہٖ درج کر دی گئی ہے تاکہ ان کروڑوں انسانوں کے صحیح جذبات کا آپ اندازہ لگا سکیں جو ہزارہا سال سے ہندوؤں کے ظلم و تعدی کے شکار ہیں۔

اب آل انڈیا مسلم لیگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک پاکستان سے اچھی طرح روشناس کرانے کے لئے ایک وفد جناب راجہ محمود آباد کی صدارت میں مقرر کیا ہے جو مختلف صوبوں کا دورہ

کر رہا ہے۔ ایک سب کمیٹی تجویز لاہور کی بنیادوں پر ہندوستان کے لئے دستور اساسی مرتب کر رہی ہے۔

یہ کتاب "پاکستان اور ہندوستان" صرف اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ مسلمانان ہند کے سامنے پاکستان کے متعلق مستند معلومات مہیا کر کے پیش کی جائیں۔ کمال اور احاطہ بشر کے بس کی بات نہیں اور میرے لئے تو یہ دعویٰ "چھوٹا منہ بڑی بات" کہلائے گا۔ میں نے مختلف رسائل، اخبارات اور خطبات صدارت کو سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی ہے، اور اکثر خطبات و مضامین تو میں نے بعینہ درج کر دئے ہیں تاکہ آپ واسطہ در واسطہ سے سننے کی مصیبت سے بچ جائیں۔

الحمد للہ کہ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی تحریر یا بیان کسی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے جس کے لئے میں نے پوری کوشش کے بعد اچھی طرح یقین نہ حاصل کر لیا ہو۔ تحریک پاکستان کے موافق و مخالف اخبارات، رسائل اور کتابوں کا ایک انبار میں نے کھنگالا ہے اور اپنے اوقات کا بہت بڑا حصہ جن میں اکثر یہ کھلی ان کی گہرائیاں بھی داخل ہیں، مطالعہ میں صرف کئے ہیں اور اسکا صلہ صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ سے جب مطالعہ فرمائیں تو صرف اسلئے اس سے بے توجہی نہ برتیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی مرتبہ کتاب ہے جو تحریک پاکستان کا موید ہے بلکہ غور فرمائیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ مسلمانان ہند کے لئے ایک پاکستان کس قدر ضروری ہے۔

عبد القدوس ہاشمی

ہندوستانی مسلمان کے سو (۱۰۰) سال

زمحکومی مسلمان خود فروش است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بہ گرفتار طلسم چشم و گوش است
زمحکومی رگاں در تن چنان است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ مارا شرع و آئین بار دوش است
(اقبال)

مسلمان کی یہ خصوصیت تھی کہ اسلام کی عالمگیر تحریک کا وہ علمبردار تھا، لیکن ملوکیت کی لعنت نے اس سے ساری خصوصیتیں چھین لیں اسلام کو بحیثیت تحریک زندہ رکھنے اور دنیا کو اس رحمت کا پیام سنانے کا حوصلہ رخصت ہوگیا، لے دے کر مسلمان کا مقصد ایک مسلمان شہنشاہی سے زیادہ کچھ نہ رہ گیا تھا۔ ہندوستان میں اس کے ساتھ ایک ایسی قوم کا تھا جو فرمان روا کو پروردگار کا اوتار سمجھتی ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان پر دنیا کے تمام مسلمانوں سے زیادہ

شاہی تقرب اور عزت درباری حاصل کرنے کا جنون طاری تھا۔

ان حالات میں مغل بادشاہت ہندوستان میں قائم ہوئی، اجتماعی زندگی میں مسلمان ہندوؤں سے بہت سی خرابیاں لے کر ایک ایسی زندگی بسر کر رہے تھے جس کا ایک خفیف سا روحانی واسطہ تو صحابہ کرام کی زندگی سے تھا، لیکن کوئی صحیح تعلق ان کی حیات طیبہ سے مسلمانوں کا باقی نہ تھا، اگر چند اشخاص سے قطع نظر کر لیجئے تو ہندوستانی مسلمان، بالکل اس شعر کا مصداق تھا۔

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

مغل فرماں رواؤں میں سے اکبر نے اس خفیف سے واسطہ کو بھی ختم کر دینے کی کوشش کی "دین الٰہی" کے نام سے ایک جدید مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔ اگر چند اللہ والے اپنی جانوں پر کھیل کر بادشاہ کا یہ کھیل بگاڑ نہ دیتے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہندوستانی اسلام کیا ہو جاتا، شائد برہمو سماج کی قسم کی کوئی چیز بن جاتی، بہر حال مغل دور حکومت میں شاہ پرستی کے جذبات میں بڑی ترقی ہوئی، اور مسلمان کی زندگی کا کوئی نصب العین باقی نہ رہا۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ چھوٹی سی ایک جماعت ایسی ضرور موجود رہی جو ان ناساز گار حالات میں سختی سے دین کے احکام کی پابند تھی، اور شائد اگر ایسے

موقع مل جاتا تو انقلاب بپا کر دیتی اور اقتدار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر مسلمان قوم کے ہاتھ میں چلا آتا لیکن مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ ہندو بادشاہ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش میں ایسی ہر تجویز کو ختم کر دینے کی سبیلیں پیدا کر دیتے اس طرح بادشاہ کا شخصی اقتدار بڑھتے بڑھتے اس درجہ پر پہنچ گیا جہاں اسے واقعتہً ایک اوتار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ صورت آپ کو اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں نمایاں نظر آئے گی۔

مغل شہنشاہی میں عالمگیر کے بعد زوال آنے لگا، اور انگریزی کمپنی کی قوت بڑھنے لگی، اب تک "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا" تو تھا، اب سے اس میں "حکم کمپنی بہادر کا" اضافہ ہو گیا، اس طرح شاہ عالم کے زمانہ میں تو ساری شہنشاہی "از دہلی تا پالم" ہو کر رہ گئی، مسلمان نے اپنا مقصد ہی مغل شاہی کو قرار دے رکھا تھا، جب یہ گئی تو ہندوستانی مسلمان بالکل بے مقصد حیات اور سراپا بے اصل زندگی بسر کرنے لگا۔

تحریکِ فرائضی انگریزوں کے ابتدائی اور مغلوں کے آخری دور میں دو خالص اسلامی تحریکیں پیدا ہوئیں، ایک مولانا شریعت اللہ صاحب (بہار)، کی تحریک "فرائضی" اور دوسری تحریک مولانا سید احمد صاحب بریلوی

کی تحریک جہاد جسے انگریزوں نے "وہابی تحریک" کا نام دے رکھا ہے۔

فرائضی تحریک بہار سے شروع ہوئی، اور بہار و بنگال ہی میں پھیلی، اس کا مقصد مزدوروں اور کسانوں کی اسلامی تربیت تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز ہندو سرمایہ داروں کو واسطہ بنا کر ہندوستان کی لوٹ میں مشغول تھے اور چٹرجی، مکرجی، نبرجی گھرانوں میں سونے چاندی کا مینہ برس رہا تھا۔ مسلمان خصوصاً بنگال کے مسلمان ان کی معاشی دست برد کے شکار ہو رہے تھے، مسلمان نے ہندوستان میں اپنا سب کچھ کھو کر جو حاصل کیا تھا وہ یہی زمینداری نظام تھا، مگر اب اس وقت وہ بھی اس کے ہاتھ سے جا رہا بلکہ بڑی حد تک جا چکا تھا۔ مولانا شریعت اللہ نے کسانوں اور مزدوروں کی اسلامی تربیت شروع کی وہ چاہتے تھے کہ اس وقت یہ چوٹ کھائے ہوئے ہیں اپنی صحیح فطرت کی طرف لوٹ جانا ان کے لئے آسان ہوگا، دولت ہاتھ سے جا چکی ہے اب "شاہ پرستی" کا کھوکھلا پن ابھی سمجھ میں آجائے گا۔ مگر افسوس کہ اس تحریک کی عمر بہت تھوڑی ہوئی، سرمایہ دار اور ان کے ایجنٹوں نے بغاوت کا الزام لگا کر اسے ختم کر دیا۔

مولانا سید احمد کی تحریک مولانا سید احمد کی تحریک بھی اسلامی بنیادوں پر مذہب و معاشرت کی اصلاح کے لئے شروع کی گئی تھی، اس تحریک کی عمر فرائضی تحریک سے بہت زیادہ ہوئی اور جب مولانا سکھوں کی چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے سرحدی صوبہ میں گئے تو اس وقت انگریزوں نے اس کی مخالفت نہیں کی مگر جب سکھوں سے پنجاب کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تو اس تحریک کو بزور کچل دیا گیا۔ ان دونوں تحریکوں کے خلاف انگریزوں کو ہندوؤں نے کس طرح تیار کیا اور کس طرح ان کی امداد سے یہ تحریکیں کچلی گئیں، اس کی ایک طویل اور دردناک داستان ہے۔

زبوں حالی ہم تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے صرف نتیجہ کی وضاحت کے لئے دو بیانات نقل کرتے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کا کیا حال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے صفحہ ۱۵۰ پر لکھتے ہیں۔

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع الملازمت

کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ احکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔"

۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ملتا تھا جس میں چپراسی چٹھی رسان یا دفتری کے سوا کوئی مسلمان ملازم ہو۔

مسٹر بیلی جو پہلے لکھنؤ کے رزیڈنٹ اور بعد کو حکومت ہند کے سکرٹری ہو گئے تھے، اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

"تعلیمیافتہ مسلمان اپنی پرانی قسم کی تربیت پر بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے کو حکومت کے عہدوں اور منافع سے جن پر اب تک وہ قابض تھا محروم پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ عام نفع کے کام ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلے گئے، اچھے تعلیمیافتہ لوگوں کے دل بے چینی سے لبریز ہو گئے ہیں، یہ احساس اس خیال پر مبنی نہ بھی ہو کہ ان لوگوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے ستایا جارہا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مذہب کی وجہ سے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔"

ان دو بیانوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت حکومت مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ

کیا مراعات تھیں، حتی کہ مسلمانوں کے اوقاف ہندوؤں کی تعلیم کے کام آتے تھے۔ ایک بار بعض منصف مزاج انگریزوں کے توجہ دلانے پر حکومت نے مسلمانوں کے اوقاف کی آمدنی کا کچھ حصہ مسلمانوں پر صرف کرنا چاہا تو ہندوؤں نے حکومت کو اس طرح متنبہ کیا۔

"اس دورِ حکومت میں جس کو رعایا پرور اور درخشاں تو کہ لیجئے لیکن زیادہ ہوشمند اور فرزانہ نہیں کہہ سکتے تھ فرائضی اور "وہابیوں" کے باغیانہ عنصر کا ہونا یقینی ہے، ان فرقوں کا تمام دیسی ریاستوں میں اثر ہے، ان کی تنظیم "جیسوٹ" یعنی عیسائیوں کے یعقوبی فرقہ سے ملتی جلتی ہے "وہابی" یوں تو کچہریوں میں کلرکیوں اور محرریوں پر کام کرتے ہیں، تجارتی خرید و فروخت میں مشغول ہیں اور ملک کی آبادی میں خاموشی کے ساتھ ملتے جلتے رہتے ہیں لیکن اپنے اصل مذہبی رنگ کو یا اپنے مقاصد کو کبھی نہیں بھولتے بغیر نمائش کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان میں اتحاد عمل ہے، مذہب کو ابتدائی سادگی پر لاکر اسلام کا سیاسی تفوق قائم کرنا چاہتے ہیں، اندیشہ ہے کہ یہ کسی وقت موجودہ تہذیب کو فنا کردیں، حکومت کو چاہیئے کہ انکی تحقیقات کرے اسکا اثر تمام غیر وہابی مسلمانوں پر بھی ہے"

(مضمون مندرجہ جریدہ "ہندو پسٹریٹ مورخہ ۲ راگست ۱۹۴۸ء")

اسلامی سادگی سے خطرہ

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سب سے بڑا جرم کیا ہے، مذہب اسلام اپنی ابتدائی سادگی پر نہ آرہے، اس طرح اسلام کے سیاسی تفوق قائم ہو جانے کا خطرہ ہے، ضرورت ہے کہ ہندوستانی مسلمان اوہام میں مبتلا رہیں، اسلام کے سیاسی تفوق کا خیال ان کے دل سے محو کر دیا جائے، اور انھیں مجبور کیا جائے کہ ہندو اوہام کو قبول کر کے وہ اچھوتوں کی طرح ہندو مت میں جذب ہو جائیں اور ہمیشہ کے لئے محکوم و مقہور کی زندگی بسر کریں، گاندھی جی نے کیا لاجواب بات کہی ہے ع

ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔

"عام اصطلاح کی رو سے تبلیغی مذہب سے جو معنی مراد ہوتے ہیں، ان معنوں میں ہندو مذہب کوئی تبلیغی مذہب نہیں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بہت سے قبائل کو جذب کر کے اپنے دائرہ میں داخل کر لیا ہے، لیکن یہ عمل بجذب تدریجی اور غیر محسوس نوعیت کا رہا ہے"

(گاندھی جی کے خیالات جلد اول ص۴۲)

اگر آپ مذہب اسلام کی ابتدائی سادگی سے دست بردار ہو جائیں تو آپ کے اولیا اور پیغمبروں کے دو چار بتوں کا ہندو علم الاصنام میں آج بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان کا غیر ملکی ہونا ذرا کھٹکے گا۔ مگر ایک ایسواں پُران اس عقدہ کو بھی حل کر سکتا ہے۔

ہندوؤں کی تحریکیں

غرض یہ کہ انگریزوں نے ہندوؤں کی تعلیم کا بندوبست کیا، اپنے ساتھ رکھ کر حکومت کے نظم و نسق میں شریک کر کے یورپ کے اجتماعی تصورات سے آگاہ کیا، اس طرح انھوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف تیار کر دیا۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد سے وطنیت کی جو رو جاری تھی، اس سے ہندو بھی متاثر ہوئے اور ان کی سیاسی و اصلاحی انجمنیں بننے لگیں، سب سے پہلی انجمن ۱۸۵۱ء میں "برٹش انڈیا ایسوسی ایشن" کے نام سے بنگال میں قائم ہوئی، اس کے بعد بمبئی میں پارسیوں کے اشتراک سے "بمبئی ایسوسی ایشن" بنی۔ مہاراشٹر میں "سروجانک سبھا" بن کر تیار ہوئی، مدراس میں "مہاجن سبھا" بنائی گئی۔

اس درمیان میں ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ ہوا مسلمان اس میں پیش پیش تھے،

مصیبت ان ہی پر پڑی، فرائضی اور وہابی تحریکوں کے خلاف انگریزوں کا جو غصہ تھا وہ اب تمام مسلمانوں کے خلاف ہوکر اُبھر آیا۔ اور ایسا ہونا فطرت انسانی بے بالکل مطابق تھا، ۱۸۵۷ء ہنگامہ میں مسلمان پیش پیش تھے، انگریزوں کی مخالفانہ توجہ بُری طرح ان کی طرف ہندول ہوگئی، اور نتیجتہً ہندوؤں کو ذرا زیادہ موقع اپنی اجتماعی طاقت کو ترقی دینے کا مل گیا۔ ۱۸۶۱ء میں ہندوستان کو دستوری اصلاحات کی جو پہلی قسط ملی اس سے بھی تمام تر فائدہ ہندوؤں نے اٹھایا۔

اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں بنگال میں "انڈین ایسوسی ایشن" قائم ہوئی۔ سر سرنیدر ناتھ نبرجی اس کی روح رواں تھے ۱۸۸۵ء میں مسٹر ہیوم انڈین سول سروس، اور لارڈ دفرن وایسرائے ہند کی مشترکہ کوششوں سے ۲۷ دسمبر کو "آل انڈیا یونین" بنی جو بعد کو آل انڈیا کانگریس بن گئی، اس کا مقصد ابتداءً یہ تھا کہ گورنمنٹ کو نظام حکومت کی اصلاح میں مشورہ دیا کرے، جیساکہ لارڈ دفرن کے بیان اور مسٹر ہیوم کے گشتی خط سے ظاہر ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوؤں نے کانگریس میں اس نیت سے شرکت نہیں کی تھی کہ گورنمنٹ کو صرف مشورہ دیں بلکہ پراچین ہندو تہذیب ومعاشرت کا احیاء اور ترویج ان کے پیش نظر تھا وہ چاہتے تھے

کہ مسلمانوں کے تمام تمدنی اثرات کو ہندوستان سے مٹا کر، خالص ہندو معاشرت و تہذیب کو ہندوستان میں رائج کردیں، اس کے لئے مسٹر پٹا بھی سیتا رامیا کی کتاب تاریخ کانگریس کا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔ مسٹر پٹا بھی ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی صدارت کے امیدوار تھے، اور ان کی شکست کو گاندھی جی نے اپنی شکست سے تعبیر کیا ہے، یہ مجلس عاملہ کانگریس کے رکن بھی رہے ہیں، اور یہ کتاب بابو راجندر پرشاد (اس وقت صدر کانگریس) کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس لئے اس بیان کو کانگریس کے افیشل بیان کی حیثیت حاصل ہے فرماتے ہیں۔

"ان اصلاحی تحریکوں سے ملک میں قومیت کی مخالفت کرنے کے جو رجحانات پیدا ہوگئے تھے ان کے خلاف قدرۃً ایک ردعمل ہونا لازم تھا جس سے ان رجحانات کی اصلاح ہوسکتی چنانچہ شمال میں تقدس مآب سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی اور جنوب میں تھیوسوفیکل تحریک کی بنیاد پڑی ان تحریکوں نے ادھرمی (ملحدانہ) خیالات اور دھرم سے انکار کی اس ذہنیت کی اصلاح کی جو مغربی تعلیم سے ملک میں پیدا ہورہی تھی، دونوں تحریکیں بالکل قوم پرستانہ

تحریکیں تھیں۔ البتہ آریہ سماج تحریک جو اپنے وجود کے لئے سوامی دیانند اعظم کی منت پذیر ہے اپنے حب الوطنی کے جوش میں جارحانہ نوعیت کی تھی۔ ویدوں کی تعلیم کے منزہ عن الخطا ہونے اور ویدک کلچر کی برتری کے عقیدہ کے ساتھ سختی کے ساتھ وابستگی کے باوجود یہ تحریک وسیع پیمانہ پر معاشرتی اصلاح کے خلاف نہ تھی، اس طرح اس تحریک نے قوم میں ایک ایسی مردانہ زندگی پیدا کی جو ان کمالات کے ساتھ جو قوم کا ورثہ تھے ماحول کی تمام خوبیوں کی بھی جامع تھی، ہندو قوم میں جو معاشرتی خرابیاں اور مذہبی توہمات موجود تھے ان میں سے بعض کے خلاف اس تحریک نے اس طرح جنگ کی جس طرح برہمو سماج نے شرک، بت پرستی اور تعدد ازدواج کے خلاف جنگ کی تھی، بلاشبہ جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی خود آریہ سماج میں دو نقطہ ہائے خیال پیدا ہو گئے ایک میں گروکل خیال کے لوگ شریک تھے جو ویدک تصور کے برہمچاریہ اور مذہبی خدمات کے حامی تھے اور دوسرے وہ جو جدید قسم کے تعلیمی اداروں کے ذریعہ ضروری حد تک جدید مغربی تہذیب حاصل کر کے سوسائٹی کا احیاء چاہتے تھے، سوامی شردھانند شہید اور مسٹر لالہ لاجپت رائے

دونوں اپنے اپنے نقطہ ہائے خیال کے علم برداروں کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔

یہ تمام تحریکیں حقیقۃً ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں اور اب قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے جس کے ذریعہ تعصبات اور اوہام کو رفع کیا جائے اور قدیم دین یعنی ویدانتی تصوریت (آئیڈیل ازم) کا احیا کرکے اور نکھار کر اسے عہد جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جا سکے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ اس مشن کا پورا ہونا مقدر تھا"

(تاریخ کانگریس صـ۲۲)

کون کہہ سکتا ہے کہ اس مشن کے پورا کرنے میں کانگریس نے کسی وقت بھی کوتاہی کی۔ کانگریس جب بنی تو ہندوؤں نے مندرجہ بالا نصب العین کو سامنے رکھ کر شرکت کی، چونکہ جزیرہ نمائے ہند کے باشندوں میں ہندو ہی جدید طرز کی قومیت اور جمہوریت سے واقف تھے یہی انگریزی تعلیم سے بہرہ اندوز تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی آبادی میں اکثریت رکھتے تھے، ان کا اور ان کے "ویدانتی تصوریت" کا اثر کانگریس پر چھا گیا، اجلاس پر اجلاس ہونے شروع ہونے لگے

وو گمؤ رکھشا" کی فکر ہونے لگی، ہندی میں کیریچر چھپنے لگے، اور وہ سب کچھ ہونے لگا
جس کی داستان بہت طویل ہے، اور میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔

ہندوؤں کے اس طرز عمل سے مسلمانوں کا ناخوش ہونا ایک طبعی امر تھا، اس لئے وہ من حیث القوم ان تمام جھگڑوں سے الگ رہے البتہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر کانگریس اور مسلمانو ں کے مابین بارہا صلح ہوئی، لیکن یہ صلح کس طرح ٹوٹی اور کس کس طرح اتحاد کو ختم کیا گیا، اس کا مختصر تذکرہ آئندہ اسی مضمون میں آپ کو ملے گا۔

۱۹۰۶ء جب مسلم لیگ قائم ہوئی توان ہی تاریخوں میں ہندوؤں نے ہندو مہا سبھا بھی قائم کی اس میں اور کانگریس میں صرف فرق یہ ہے کہ جو کام کانگریس کرتی ہے وہ مہا سبھا کہتی بھی ہے اور کرتی بھی

وطنیت کی ابتدا

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ یورپ کے حالات سے واقف ہونے اور مغربی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد ہندوؤں میں ایک وطنی و ثقافتی قومیت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری امر تھا، محکوم پر حاکم کے خیالات کا اثر پڑنا ضروری ہے، ایک قوم اپنے ان آقاؤں سے جو ہمیشہ ان کو مسلمانوں کے خلاف سکھاتے رہتے ہیں اُن کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔

دانایاں فرنگ کی دانائی دل و دماغ میں گھر کر چکی ہے ان کی ہر چیز پسندیدہ سمجھی جاتی ہے ان حالات میں ایک قوم دوسرا جنم لیتی ہے۔ یہ بجا کہ مغل دور حکومت میں ہندوؤں کو ہر طرح کا آرام حاصل تھا، اقتدار حاصل تھا، عزت و وقار حاصل تھا ان میں سے گورنر بھی ہوتے تھے اور وزیر بھی، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں حکمران اور فاتح کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے ان میں اپنی ثقافت اور تہذیب کو زندہ کرنے کا خیال اگر پیدا ہوا تو تعجب خیز بات نہ ہوئی موجودہ نیشلزم کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ "اپنی تہذیب سب تہذیبوں سے اچھی اور اپنا دیس سب دیسوں سے اچھا" اس لئے ہندوؤں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو گیا۔

ہندو نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے جزیرہ نمائے ہند کے باہر کہیں اپنا وجود نہ ملا۔ اور خود گھر میں ہندوؤں کی حالت یہ تھی کہ آپس میں نسلی، وطنی، معتقدات اور مذہب کے اعتبار سے زبان اور طرز بود باش کے اس قدر بنیادی اختلافات موجود تھے کہ کوئی وجہ مشترک جدید خطوط پر قومیت کی تعمیر کے لئے نہ مل سکی، اس لئے برطانیہ کے قائم کردہ حدود کو اس نے اپنے وطن کے حدود قرار دئیے اور اسی کو قومیت کی بنیاد قرار دیا، اس طرح اس نے مالابار کے برہمن

اور آسام کے منبھر کو ایک قوم بنانے کی سبیل نکالی لنڈی کوتل سے لے کر راس کماری تک اور برما سے لے کر کاٹھیاواڑ تک اُس نے وطن قرار دیا، اس کے لئے خاص عبادت گاہ بنارس میں بنائی گئی، جہاں ہندوستان کے نقشہ کی پرستش ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ برہما کی علیحدگی، اور لنکا کا ہندوستان میں شامل نہ ہونا ہمیشہ ہندو کو بہت شاق گذرا۔

بدقسمتی سے اسی حصۂ زمین میں جسے برطانوی ہند کہا جاتا ہے مسلمان بھی رہتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو مزعومہ ہندوستانی قوم کا جزو اور بقول ڈاکٹر مونجے صاحب "ہندو مذہب کا ایک فرقہ" بنادیا گیا۔

وطنیت اور ہندو دھرم ہندو کے لئے وطنیت کو بنیاد قرار دے کر قومیت کی تعمیر نہ صرف آسان بلکہ اس کی فطرت کے عین مطابق تھی، برہمن اور اس کا مذہب دونوں ہندوستان سے وابستہ ہیں، نہ تو دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں برہمن پایا جاتا ہے۔ اور نہ اس کے مذہب کے لوازم۔ گنگا جل، ہردوار کی مقدس دُواری اور گوکل کے پوتر صحرا کہاں مل سکتے ہیں، خاک وطن کی پرستش اپنی نسل کو دنیا کی تمام نسلوں سے اعلیٰ سمجھنا جدید قومیت کے

بنیادی اجزا رہیں، اور یہ اجزاء ہندو کی سرشت میں موجود تھے۔ اس کے لئے کسی عالمگیر اخوت اور بین الاقوامی برادری کا تصور بھی محال تھا۔ اس لئے انگریزوں کی لائی ہوئی قومیت میں اُسے وہ چیز نظر آئی جسے دیکھ کر اس کی روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

مسلمانوں کی بےچینی لیکن اسلام دنیا کو ایک عالمگیر اخوت اور بین الاقوامیت کا پیام دیتا ہے، اس لئے ہندوستان کا مسلمان اس نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا تھا، اس کا جی چاہتا ہے کہ ہندوستان کے برہمن اور انگلستان کا عیسائی دونوں مسلمان ہو کر اس کے بھائی ہو جائیں۔ سائبیریا کا ایک مسلمان اس کو اپنے پڑوسی برہمن سے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے، صدیوں کی ملوکیت نے اسے بے مقصد ضرور بنا دیا تھا مگر مسلمان کی فطرت نہیں بدل سکتی اور نہ کچلی جا سکتی ہے، اس لئے ہندوستان میں جب اس نے ایک ایسی قومیت کی داغ بیل پڑتے دیکھی تو اس پر بے چینی طاری ہو گئی، اور گھبرا کر بول اٹھا کہ "ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، انھیں باہم انضمام کے ذریعہ ایک نہیں بنایا جا سکتا"۔

یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو جو یادداشت مسلمانوں نے لارڈ منٹو وائسرائے ہند

کے سامنے پیش کی اور جسے ہم بجا طور پر جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی کوشش کہہ سکتے ہیں، اس میں واضح کیا گیا ہے کہ :-

"قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے، جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اور ہمارے اغراض و مصالح ایسے ہیں جن کا تعلق بلاشرکت غیرے ہم سے ہے، ان میں کسی دوسری قوم کو دخل نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے اغراض و مصالح کی حفاظت اس وقت تک پوری طرح نہیں کی گئی اس لئے ہم مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ حتیٰ کہ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد بلحاظ آبادی بہت زیادہ ہے وہاں بھی اس کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا گیا گویا سیاسی حیثیت سے وہ بالکل بے وقعت ہیں، اور گویا انصاف ان کے ساتھ بے اعتنائی کئے جانے کا مانع نہیں ہے۔ پنجاب میں ایک حد تک یہی حال ہے، مگر سندھ اور شرقی بنگال میں مسلمانوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔

مسلمانوں کی تحریکات

۱۸۵۷ء سے پہلے مسلمانوں پر فرائضی اور وہابی تحریکوں کی

خاطر ظلم کیا گیا۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی پاداش میں مظالم بھگتنے پڑے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں اُن پر جو سراسیمگی طاری ہوئی وہ کچھ تعجب خیز نہیں، مدتوں تو انہیں اپنی منظیم کا کوئی موقع ہی نہیں ملا۔ اور نہ کوئی قابل ذکر اجتماعی کام ہوا۔

تحریک علی گڑھ سب سے پہلی جو قابل ذکر تحریک پیدا ہوئی وہ مرحوم سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک تھی، سر سید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس وقت جدید تربیت کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اور علی گڑھ کا مشہور کالج قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی ہو گیا۔ ممکن ہے کہ علاج کے دریافت میں سر سید سے غلطی ہو گئی ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مرض کو پہچاننے میں اس طبیب نے غلطی نہیں کی، کچھ دنوں کے بعد ہی علی گڑھ مسلمانوں کی تمام اجتماعی تحریکوں کا مرکز بن گیا، اور ایسا ہونا بالکل یقینی تھا، مسلمانوں میں اس وقت کوئی تحریک بڑے پیمانہ پر موجود نہ تھی، اس لئے لازماً علی گڑھ کو مرکزیت حاصل ہو جانا چاہئے تھی۔

ندوۃ العلماء کچھ دنوں کے بعد مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے علماء کی حالت پر غور کر کے یہ درد محسوس کیا کہ

دینی تعلیم میں ایک نظم جدید کی ضرورت ہے، نصاب اصلاح کا محتاج ہے، خود علماء کی تربیت خام ہے، ان کو جدید حالات سے باخبر ہونا چاہیئے چنانچہ اس کے لئے انھوں مجلس ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی، علماء ایسی آسانی سے کسی اصلاحی تحریک کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھے، اس لئے مجبوراً ندوۃ العلماء کو ایک اپنا دارالعلوم قائم کرنا پڑا تاکہ وہاں سے جدید حالات سے واقف علماء پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ان سے کام لیا جائے، ندوۃ العلماء کے پروگرام میں سے صرف دارالعلوم ہی ایک جز باقی رہ گیا، اور بھی اپنی خصوصیتوں کو کھودینے کے بعد صرف ایک مدرسہ رہ گیا ہے جو لکھنؤ میں کچھ نہ کچھ خدمت انجام دے رہا ہے

تحریک علی گڑھ اور تحریک ندوہ اصل میں صرف تعلیمی تحریکیں تھیں اور تقریباً ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی نصب العین کے ماتحت شروع ہوئی تھیں، لیکن چونکہ دوسری کوئی سیاسی تحریک موجود نہ تھی اس لئے تمام تر توجہ ان ہی دو تحریکوں کی طرف مبذول رہی ۔

ڈیفنس ایسوسی ایشن

علی گڑھ اب مسلمانوں کی تمام اجتماعی تحریک کا مرکز ہو گیا تھا، ادھر ہندوستان کو کئی قسطیں اصلاحات کی بھی مل چکی تھیں، اور مسلمانوں کے تمام حقوق کی پامالی انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کو چونکا رہی تھی اس طرح ۱۸۹۳ء میں سب سے

پہلی سیاسی جماعت "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے نام سے علی گڑھ میں قائم ہوئی۔ آج جن معنوں میں کسی جماعت کو سیاسی کہا جاتا ہے، ان معنوں میں یہ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی، اور مسلمانوں کی الگ تنظیم بھی سب سے پہلے اسی وقت شروع ہوئی۔

جداگانہ انتخاب "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کی طرف سے سید محمود مرحوم نے اصول انتخاب پر ایک یادداشت مرتب کی جسمیں مخلوط انتخاب کی سختی سے مخالفت کی گئی تھی، اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقۂ انتخاب رائج کیا جائے، یہ "ایسوسی ایشن" بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی، جو لوگ اس میں کام کرنے والے تھے وہی علی گڑھ کی تعلیمی تحریک چلا رہے تھے، یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ تعلیمی تحریک کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہوں، اس لئے "ایسوسی ایشن" بے توجہی کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔

تقسیم بنگالہ کچھ دنوں کے بعد لارڈ کرزن وائسرائے ہندوستان نے بنگال کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کردینے کی تجویز پیش کردی، اس سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو جاتی تھی اس لئے قوم پرست ہندوؤں کا ایک طوفان اٹھا اور اتنا سخت اٹھا کہ بنگال، بہار، اودھ اور یوپی کے دیگر اضلاع میں سیکڑوں جگہ ہندوؤں

اور مسلمانوں کے مابین خوں ریز فسادات ہوئے۔ بعض جگہ تو درجنوں مسلمانوں کو زندہ جلادیا گیا۔ حالانکہ مسلمان بے قصور تھے، ان کی طرف سے تقسیم بنگالہ کا مطالبہ کبھی نہ کیا گیا تھا۔

خدا خدا کرکے لارڈ کرزن کا طوفانی دور ختم ہوا۔ ادھر انگلستان کی پارلیمنٹ میں قدامت پسند جماعت کو شکست ہوگئی، اور اس کی جگہ اعتدال پسند جماعت برسر اقتدار آگئی، لارڈ مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، حکومت کی طرف سے ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جدید اصلاحات کا مسئلہ برطانوی پالیمان کے سامنے تھا۔ اس کی خبر لگتے ہی، ہندوؤں نے ان اصلاحات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کی، اور تقسیم بنگالہ کے خلاف جو ہنگامہ جاری تھا، اسے ختم کردیا گیا۔

وائسرائے کو ایڈریس مسلمانوں کی کوئی سیاسی انجمن موجود ہی نہ تھی، ان کے حقوق کی نگرانی کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا۔ نواب وقار الملک اور سر آغا خان کے ساتھ چند اصحاب علی گڑھ میں بیٹھے، اور غور و خوض کے بعد یہ طے کیا گیا کہ وائسرائے کے سامنے ایک یادداشت پیش کی جائے۔ اور بتایا جائے، کہ مسلمانوں کے بنیادی حقوق کیا

کیا ہیں جن سے بے توجہی برتی جارہی ہے، اور آئندہ اصلاحات میں اپنے کن حقوق کی نگرانی مسلمان ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ یادداشت ایڈریس کی شکل میں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو وائسرائے کے سامنے پیش کی گئی۔ چونکہ یہ یادداشت ہندوستان میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کی پہلی کوشش ہے، اسلئے اسکے چند ٹکڑے ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ گاندھی جی کا یہ دعویٰ کہ لاہور کے اجلاس مسلم لیگ سنہ ۱۹۴۰ء میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے علیٰحدہ قوم ہونے کا تصور پیدا کیا گیا ہے کس قدر مبنی برحقیقت ہے۔

جدید جمہوریت سے خطرہ

ایڈریس کے ابتدائی حصہ میں جزیرہ نمائے ہند میں بسنے والی مختلف قوموں کا سیاسی پوزیشن واضح کرتے ہوئے جمہوری طرز حکومت کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:-

"جو طریقہ نیابت (قائم مقامی رعایا) کا یورپ میں رائج ہے وہ ہندوستان کیلئے بالکل جدید ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے دوراندیش افراد کا خیال ہے کہ اس طریقہ کو ہندوستان کی موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے نہایت حزم واحتیاط اور مآل اندیشی سے کام لینا پڑے گا جو اگر نہ لیا جاسکا تو منجملہ اور خرابیوں کے ایک بہت بڑی

خرابی یہ پیش آئے گی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سفید ایک ایسی جماعت کے حوالہ ہو جائے گا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے"۔

مخلوط انتخاب سے نقصان

مخلوط انتخاب کی بنیادی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ :-

"موجودہ قاعدوں کی رو سے یہ امر بعید از قیاس ہے کہ ان جماعتوں کی طرف سے جن کو انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے کسی مسلمان کا نام انتخاب کے لئے پیش کیا جائے تاوقتیکہ وہ اہم معاملات میں اکثریت والی قوم کے ساتھ ہم نوا بننے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگر انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو ہمارے ہندو ہموطنوں کی یہ خواہش قابل اعتراض نہیں ہے کہ وہ اپنی قوت سے فائدہ اٹھا کر صرف اپنی قوم کے افراد کو ووٹ دیں، یا غیر قوم کے کسی ایسے شخص کو منتخب کریں جس کے متعلق انھیں یہ پوری طرح یقین ہو کہ وہ ہندوؤں کی کثیر جماعت کی خواہش کے مطابق رائے دیا کرے گا۔ اور اس شخص کے لئے حقیقۃً اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا دوبارہ انتخاب ہندوؤں کی خوشنودی پر منحصر ہو گا"۔

علیٰحدہ قومیت

اسی یادداشت میں ہندوستان میں مسلمانوں کی علیٰحدہ قومیت پر اس طرح زور دیا گیا ہے کہ:۔

"قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہیں جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے ہمارے اغراض و مصالح ایسے ہیں جن کا تعلق بلاشرکت غیرے ہماری ذات سے ہے، اور جن میں کسی دوسری قوم کا بالکل دخل نہیں ہے"۔

مسلم لیگ

اس یادداشت کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ حکومت اگر اس سلسلہ میں خط و کتابت کرے، اور سوال و جواب کی نوبت آئے تو کون اس کام کی ذمہ داری لے گا، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک سیاسی ادارہ قائم کر دیا جائے، چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو سارے ہندوستان کے نمائندے ڈھاکہ میں جمع ہوئے، اور نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب مرحوم کی صدارت میں "مسلم لیگ" کے نام سے ایک مرکزی سیاسی جماعت کی تاسیس عمل میں آئی۔

منٹو مارلے اصلاحات

"منٹو مارلے" اصلاحات میں مسلمانوں کے مطالبات میں سے جداگانہ طریقہ انتخاب منظور کر لیا گیا، اس لئے انھوں نے اس کے کامیاب بنانے میں اعتدال پسند ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ ۱۹۱۳ء تک مسلم لیگ کے کئی اجلاس کراچی، امرتسر،

دہلی، ناگپور، اور ڈھاکہ میں ہوئے جن میں حکومت کے خلاف سخت سخت چیمنیاں کی گئیں، بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا کر دی تھی اور مسلمان ہندوستانی سیاسیات میں پیش پیش نظر آنے لگے تھے۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا چھٹا اجلاس جو لکھنؤ میں ہوا اس میں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین

"برادران وطن سے اتحاد اور ہندوستان کے لئے مناسب حال حکومت خود اختیاری حاصل کرنا"

قرار دیا۔ اسی سال قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح جو اس وقت کانگریس کے بڑے سرگرم لیڈر تھے مسلم لیگ میں شامل ہوئے، مئی ۱۹۱۴ء میں کانگریس نے مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ایک وفد لندن بھیجا تاکہ وہ جدید اصلاحات پر ہندوستان کے خیالات کی ترجمانی کریں انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ترجمانی کا فرض انجام دیا، اس کے بعد جنگ چھوٹ پڑی اور اصلاحات کا سارا قصہ التوا میں پڑ گیا۔

جنگ عظیم جنگ ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے اور آتے ہی اعلان کیا کہ :۔ "ہندوستان کے ہر تندرست باشندے کو اس نازک

وقت میں سلطنت برطانیہ کی امداد کرنی چاہیے کیونکہ صرف اسی خدمت کے بعد ہندوستان برطانوی سلطنت میں اعزاز کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔"

(ریپرزنٹو انڈینس ص ۱۶۲)

اس طرح کانگریس نے ابتدا ہی میں اپنی رائے ظاہر کر دی، لیکن مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا آسان نہ تھا، ترکی کے متعلق یہ باور کیا جاتا تھا کہ وہ برطانیہ کے خلاف جنگ میں شریک ہو رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو چند ملت فروشوں کے سوا کون کہہ سکتا تھا کہ جنگ میں برطانیہ کی مدد کریں، آزاد مسلم زعماء ایک ایک کر کے جیل، جلا وطنی اور نظر بندی کے شکار ہوئے، جو دو چار رہ گئے وہ دم بخود تھے، ان ہی بیچاروں میں مسٹر جناح بھی تھے جنھوں نے سنہ ۱۹۱۶ء میں مشہور "میثاق لکھنؤ" کر کے متحدہ پلیٹ فارم پیدا کیا۔

خدام کعبہ و خلافت جنگ کا زمانہ گذر گیا برطانیہ کی وعدہ خلافیوں سے اسلامی ممالک کا حال جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے، مسلمانوں میں خدام کعبہ اور خلافت کی تحریک نے زور پکڑا اور رولٹ ایکٹ جلیانوالہ کا اجتماع اور اس پر فائرنگ نے ملک میں ادھر سے ادھر تک آگ لگا دی موقع شناس ہندو زعماء نے ہاں میں ہاں ملائی، اور

اور ستارۂ سحری کی چمک کی طرح ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد رونما ہو گیا۔

تحریک خلافت کا خاتمہ مصطفیٰ کمال مرحوم کی ناعاقبت اندیشانہ حرکت "ختم خلافت" کی بنا پر ہونا ہی چاہئے تھا، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی پراگندگی کی اصلی وجہ کانگریس کے ذمہ دار اشخاص کی طرف سے "شدھی سنگھٹن" کی تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو مرتد کرنا تھا، اس سلسلہ میں سارے ہندوستان میں خوں ریز فسادات ہوئے، اور مسلمان بری طرح اس ہنگامہ میں الجھ گئے۔

جنگ کے بعد ہندوستان میں جو جمعیتیں بنیں اور بگڑیں، ان میں ایک جمعیتہ العلماء بھی تھی، لیکن چونکہ یہ کوئی تحریک نہ تھی بلکہ اس کی حیثیت "جمعیتہ وکلاء" "جمعیتہ طلباء" اور "جمعیتہ آل تیمور" وغیرہ کی سی تھی، اور ایک خاص قسم کے سند یافتہ علماء ہی اس میں شریک ہو سکتے تھے، اس لئے اس کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا، البتہ علماء کرام اپنی انفرادی حیثیت سے مختلف تحریکوں میں کام کیا کرتے تھے، اس لئے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کا ہنگامہ شروع ہوا۔ یہ ہندوستان کا مجوزہ دستور اساسی تھا، جو لکھنؤ کی

ایک آل پارٹیز کانفرنس کے حکم سے تیار ہوا تھا چونکہ پنڈت موتی لال نہرو اس دستور ساز جماعت کے صدر تھے اس لئے اسے نہرو رپورٹ کہتے ہیں۔ اس میں خالص "ہندو راج" کا نقشہ کھینچا گیا تھا، اس لئے اس کی مخالفت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی اس کے لئے ایک مسلم کانفرنس بنائی گئی، جو نہرو رپورٹ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، لیکن جب تک رہی اس نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی یہاں تک کہ نہرو رپورٹ کو لاہور کے اجلاس کانگریس میں مجبوراً دریا برد کر دیا گیا، کیونکہ حکومت برطانیہ کانگریس کی خواہش کے مطابق مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اسے منظور کر لینے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔

نمک سازی اس وقت گاندھی جی نے دیکھا کہ انگریز اب بھی ہندوستان سے معاملہ کرنے میں مسلمانوں کو کسی قدر سیاسی اہمیت دیدیتے ہیں اس لئے انھوں نے "قانون نمک سازی" کی خلاف ورزی شروع کی، تاکہ اس طرح برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال کے اپنے لئے سارے ہندوستان کی طرف سے بولنے کا حق حاصل کر لیں بعض مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ یہ جنگ آزادی ہے مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی وغیرہ کی انتہائی کوشش کے باوجود ہزاروں مسلمان اس غلط فہمی کا شکار ہو کر جیل چلے گئے۔ اس وقت مسلم لیگ ہندوؤں اور مسلمانوں میں

جناح کے مشہور چودہ نکات پر مصالحت کرانے میں مشغول تھی۔

گول میز کانفرنس

گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کا اختتام اس طرح ہوا کہ وائسرائے اور گاندھی جی نے آخر میں مصالحت کرلی اور ہندوستان کے لئے دستور اساسی تیار کرنے کے لئے جو گول میز کانفرنس لندن میں ہورہی تھی گاندھی جی اسمیں شرکت کیلئے روانہ ہوگئے، وہاں پست اقوام کے نمائندوں، والیان ریاست اور مسلمانوں نے گاندھی جی کا حق نمائندگی قبول کرنے سے انکار کردیا ہندوؤں نے فرقہ وار حقوق کی تعیین کا کام مسلمانوں کی مرضی کے خلاف مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کے سپرد کردیا۔ وزیر اعظم نے جیسا ان کی سمجھ میں آیا۔ ایک متعین شکل اس کی بنادی، اس میں شرط یہ رکھی تھی کہ جب کوئی دو قوم سمجھوتہ کرکے دوسری شکل پیش کرے گی قبول کرلیا جائے گا۔ گاندھی جی نے پست اقوام سے ایک "مرن برت" رکھ کر خاطر خواہ ترمیم کرائی، اس طرح ان کی انفرادیت تو رخصت ہوگئی مگر مسلمان وزیر اعظم کے متعین کردہ حقوق سے ناخوش ہونے کے باوجود اپنی قومی حیثیت کھوکر ہندوؤں میں جذب ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے اس لئے جب ۱۹۳۵ء کا جدید دستور بن کر آیا تو اس میں فرقہ وار عطیہ کا وہ حصہ باقی رہ گیا جو مسلمانوں سے متعلق تھا، کانگریس نے تو اس وقت

اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرلی، مگر کانگریس کے ذمہ دار ارکان اس کے خلاف شورش میں شریک رہے، ہندوستان بھر کے ہندوؤں نے مخالفت کا طوفان اٹھایا۔ اعتراض یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو ان علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے مجالس قانون ساز میں ہندوؤں سے زیادہ نشستیں دی گئی ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس فرقہ وار فیصلہ میں پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں کو اقلیت بنا دیا گیا تھا۔

دستور ۱۹۳۵ء

سنہ ۱۹۳۵ء کا دستور دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک صوبہ دار انتظام اور دوسرا مرکزی نظم، صوبہ دار انتظام اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر صوبہ ایک گورنر کے ماتحت نیم خودمختار ریاست ہے جس کی اپنی مقننہ ہے، اگرچہ اہم مدات مرکز کے ماتحت ہیں لیکن بہت سے مدات میں صوبہ جات اپنی مرضی سے عمل کرسکتے ہیں مرکزی نظم یہ ہے کہ ان ہی نیم مختار صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفاقی ایوان ہوگا جو وایسرائے کے ماتحت سارے ہند کے لئے قانون بنائے گا اور مرکزی وزرا اسی ایوان کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

نئے دستور کا نفاذ

سنہ ۱۹۳۷ء میں دستور سنہ ۱۹۳۵ء کے صوبہ واری حصہ کا نفاذ ہوا انتخابات میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے حصہ لیا

کانگریس نے ملک کے سامنے یہ اعلان کیا کہ دستور ۱۹۳۵ء کو توڑ دینے کے لئے شریک ہو رہی ہے، اور مسلم لیگ نے اپنی شرکت کے مقاصد ایک طویل بیان میں واضح کئے جس میں مختلف تعمیری ارادے شامل تھے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ دستور ۱۹۳۵ء کے دونوں اجزاء مضر ہیں۔ ان کی جگہ دوسرا دستور جاری کرنا مسلم لیگ کا نصب العین ہو گا، مگر جب تک یہ نصب العین حاصل نہ ہو، جدید دستور کے ماتحت وہ تمام فائدے حاصل کئے جائیں گے جو ملک کی قومی زندگی اور اہل ملک کی فلاح کے لئے ضروری ہوں۔

کانگریس کا غرور انتخابات کے نتائج جب برآمد ہوئے تو کانگریس کو (۱۱) صوبوں میں سے سات میں اکثریت حاصل ہو گئی، چار ماہ تک کانگریس نے وزارت قبول کرنے سے انکار کیا، اور مسلم لیگ نے بھی کہیں یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لی، مگر اس چار ماہ کے اندر ایک سازش گورنر مدراس کے واسطے سے کانگریس اور حکومت ہند کے درمیان ہو گئی۔ کانگریس نے وزارتیں قبول کیں، اس وقت مسلمانوں کے لئے بڑی نازک صورت پیدا ہو گئی، کانگریس نے مسلمانوں کے قومی وجود سے انکار کر دیا، اور اعلان کیا کہ وہ ہندوستان میں صرف ایک قوم کے وجود کی قائل ہے۔ کانگریس پورے ہندوستان کی واحد

نمائندہ جماعت ہے، اس طرح نہ کوئی مسلمان قوم ہندوستان میں موجود ہے، نہ اس کی کوئی خاص تہذیب ہے، اور نہ اس کا کوئی نمائندہ ادارہ ہے۔ اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ویدک تہذیب اور ویدک تصورات زندگی کو زندہ کرنے اور مسلمان کو اس جزیرہ نما سے نابود کرنے کے لئے وزارتوں نے کیا کیا کام کئے وہ بہت مشہور اور زبان زد ہیں، اس لئے ہم انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مسلم لیگ کی گرمی

کانگریس کا یہ رویہ مسلم لیگ کے لئے چیلنج تھا، مسلم لیگ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں کی تنظیم شروع کر دی، ۔ دو سال کے اندر اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیٰحدہ قوم ہیں، ان سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اب کانگریس نے بار بار کوشش کی کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو جائے، لیکن یہ تسلیم کرنے کو اب تک تیار نہیں ہے کہ ہندوستان میں مسلمان نام کی ایک قوم بستی ہے، اور اس سے سمجھوتہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے جیسے دو قوموں میں ہوتا ہے۔

موجودہ جنگ

سنہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ اور جرمنی کے مابین جنگ چھڑ گئی، اس وقت کانگریس نے حکومت ہند پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے وزارتیں چھوڑ دیں، امید یہ تھی کہ دو تین ماہ کے اندر

جنگ کی نازک صورت حال سے مجبور ہو کر حکومت برطانیہ کانگریس کے آگے جھک جائے گی، جب ایک سال بسر ہو گیا اور برطانیہ سے معاملہ نہ ہوسکا، تو مجبوراً کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی شروع کردی اس وقت مسلمانوں اور تمام دنیا کو فریب دینے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا صدر بنا دیا گیا ہے، لیکن اختیارات سارے گاندھی جی کے ہاتھ میں ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد ایک نمایشی صدر سے زیادہ کوئی حیثیت کانگریس میں نہیں رکھتے۔

مسلم لیگ نے جنگ کے بعد اعلان کیا کہ مسلمان برطانیہ کا ساتھ صرف اسی صورت میں دے سکتے ہیں جب کہ ان کے چند مطالبات منظور کرلئے جائیں، ان میں سے کچھ منظور ہو رہے ہیں، اور کچھ بنیادی مطالبہ منظور نہیں ہوے ہیں، اس لئے مسلم لیگ اس وقت خاموش ہے اور جنگ کے اختتام تک تحریک پاکستان کے سلسلہ میں بجز نشر و اشاعت، اور اس کی تشریح و توضیح کے کوئی اور قدم اٹھانا نہیں چاہتی۔ پاکستان کی تفصیلی اسکیم زیرغور ہے مختلف صوبوں میں مسلم لیگ کی طرف سے تعمیری کام ہو رہا ہے۔

یہ ہے ہندوستانی مسلمانوں کے پچھلے سو سال کا نہایت مختصر تذکرہ، جو یقیناً تشنہ ہے اور بہت تشنہ لیکن ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اصل موضوع پر غور کرنے کے لئے اسی قدر کافی ہے، آپ کے حافظہ میں جو بہت سی باتیں

موجود ہیں انھیں آپ اس مختصر مضمون کی مدد سے یاد فرما سکتے ہیں۔

ہندوستان کے دستوری اصلاحات

اب اس کے بعد ہم ایک فہرست اصلاحات کی دیتے ہیں تاکہ آپ کو یاد آجائے کہ اب تک ہندوستان کو اصلاحات کی کتنی قسطیں ملی ہیں۔

سنہ ۱۸۶۱ء:- برطانوی تسلط کے بعد اصلاحات کی سب سے پہلی قسط ہندوستان کو اس سال ملی صوبوں اور مرکز میں قانون ساز مجالس قائم کی گئیں جن میں ہندوستانی ممبر لئے گئے مگر انھیں حکومت نامزد کرتی تھی انتخاب نہیں کیا جاتا تھا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے بلدیات قائم کیں اور ہندوستانیوں کو کسی قدر خدمت کا موقع دیا گیا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں مرکزی اور صوبہ وار مجالس قانون ساز میں ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ ایوان تجارت، زمینداروں، اور یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک کئے گئے مجالس قانون ساز کے اختیارات میں توسیع کی گئی۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں "منٹو مارلے ریفارم" ہوا جس کے ماتحت منتخب

نمائندگان کی مجالس قانون ساز قائم ہوئیں اور لوکل بورڈ کے انتخابات جاری ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں "منٹگو، چمسفورڈ اسکیم" کا نفاذ ہوا جس کے ماتحت وزارتوں میں ہندوستانیوں کو شریک کیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں سنہ ۱۹۳۵ء کا جدید دستور ہند جاری ہوا جو سنہ ۱۹۳۹ء میں معطل ہو گیا۔

اتحاد کی کوششیں

آپ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہم ان مساعی کا ذکر بھی کئے دیتے ہیں جو اب تک ہندو مسلم اتحاد کے لئے مسلمانوں نے کی ہیں اور سب کی سب ایک ایک کر کے ناکام رہیں۔

سنہ ۱۸۷۰ء:۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے مقابلہ میں برتری کا احساس اتنا سخت پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی اونچی اٹاری سے نیچے اترنے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود سرسید احمد خاں نے سنہ ۱۸۷۰ء سے لے کر کئی سال تک اس کی کوشش کی کہ مسلمان اور ہندو بھائی بھائی ہو کر رہیں حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی نسبت سے مسلمان اگر اپنے کو "ہندو" کہیں تو

بے جا نہ ہوگا۔ لیکن ہندوؤں نے شور مچانا شروع کیا کہ مسلمان باغی ہیں انھیں ہم وفاداروں سے نہیں ملایا جا سکتا (ملاحظہ ہو ہندو پیٹریٹ مورخہ ۲۰ اگست ۱۸۸۷ء) اور اسی کے ساتھ بہار و بنگال میں ذبیحہ گاؤ کو بہانہ بنا کر فسادات شروع کر دئے گئے۔

۱۸۹۳ء:۔ نواب سلیم اللہ خاں جسٹس امیر علی کی کوشش اتحاد اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک نے ایک "مخالفین ذبیحہ گاؤ" جماعت بنا کر پروپگنڈا اور دورہ شروع کیا، جس کا لازمی نتیجہ فسادات اور خون ریزی ہوا۔ اور ضلع اعظم گڈھ میں تو اتنا بڑا فساد ہو گیا کہ سارا ملک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

۱۹۱۰ء:۔ الہ آباد میں سر آغا خان، اور سید امیر علی کی کوششوں سے اتحاد کانفرنس ہوئی، اور تقسیم بنگالہ کا ہوا بنگالی ہندوؤں کے دماغ پر اس طرح طاری تھا کہ کوئی نتیجہ نکل نہ سکا۔

۱۹۱۳ء:۔ اس سال مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا اس میں "برادران وطن سے اتحاد" نصب العین قرار دیا گیا اور کوششیں شروع ہوئیں، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اجودھیا میں قربانی گاؤ پر فساد ہوا اور مسلمانوں نے اتحاد کے لئے "قربانی گاؤ" کا حق چھوڑ دیا، لیکن پھر بھی اتحاد نہ ہوا۔

سنہ ۱۹۱۴ء :- اپریل میں سر جیمس مسٹن کی کوشش سے الہ آباد میں اتحاد کانفرنس ہوئی، راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں ایک کمیٹی اتحاد کے لئے بنی۔ اس کا نتیجہ شائد کچھ نکل آتا، مگر بنگالی ہندوؤں نے شرکت ہی سے انکار کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۶ء :- نومبر میں کلکتہ میں لیگ اور کانگریس کا متحدہ جلاس سر سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں ہوا، مسٹر جناح کی کوششوں سے وہ میثاق تیار ہوا جو میثاق لکھنؤ کہلاتا ہے، ۱۲ دسمبر کو مسٹر جناح نے جو خطبۂ صدارت دیا ہے اس کا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔

"لیگ کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اس قدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے کہ کسی قسم کے اصلاحات اسے نقصان نہ پہونچا سکیں"

اس وقت مسٹر جناح پکے کانگریسی بلکہ کانگریس کے ترجمان تھے قائد اعظم سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے الگ ہوئے ہیں۔ اس میثاق کی توثیق کانگریس اور لیگ دونوں نے کردی۔

اب جب کہ لیگ اور کانگریس دونوں نے میثاق کر لیا تو کانگریس سے طاقتور عناصر الگ ہو گئے۔ اور انھوں نے "ذبیحہ گاؤ" اور دیگر مسائل پر فسادات کرانے کا مشغلہ شروع کیا۔ اس میثاق کو بنگالی

ہندوؤں نے مختلف ہنگاموں، اور بہاری ہندوؤں نے گاندھی جی کی ہدایات کے تحت آرہ کے مشہور خونیں فسادات سے بے اثر کردیا، اور گاندھی جی نے تو ۱۹۱۸ء میں صاف اعلان کردیا کہ ہندو بزور شمشیر ذبیحہ گاؤ بند کرادیں گے (ملاحظہ ہو گاندھی جی کا مضمون ترجمہ الفضل ۹ مارچ ۱۹۱۸ء)۔

۱۹۲۴ء:۔ علی برادران کی ساری کوشش اتحاد کس طرح ختم ہوگئی۔ اس کا قصہ خود حضرت مولانا محمد علی مرحوم سے سنئے۔

"جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خاں مرحوم نے مجبور ہوکر ان سے صاف کہدیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں"
(سیرۃ محمد علی ص ۱۴۹)

تمام کانگریسی شدھی سنگھٹن میں علانیہ یا درپردہ شریک تھے، اتحاد کرتا تو کون کرتا۔ اور دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو قبول کرتا تو کون۔

۱۹۲۸ء:۔ کی کوششیں نہرو رپورٹ سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں۔

۱۹۳۱ء:۔ میں اتحاد کی کوشش لندن میں ہوئی، زعماء قوم گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے وہیں تشریف رکھتے تھے، کیا نتیجہ نکلا

اور کیوں نکلا ایک سخت کانگریسی بلجہ نیشلسٹ پارٹی کے سکرٹری تصدق احمد شروانی مرحوم سے سنئے۔

"سر محمد شفیع نے مسلمانوں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی تھی کہ معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کردیا جائے۔

مگر پنڈت مدن موہن مالویہ نے اسے صرف ایک نشست کی کمی بیشی کی بنا پر نامنظور کردیا، اور چونکہ ہندوؤں کو "بیداری ہند" کے مصنف مسٹر ریمزے میکڈانلد وزیر اعظم انگلستان سے توقعات تھیں اس لئے ان کے نام مراسلہ لکھا گیا کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں"

اس مراسلہ پر کسی مسلمان نے دستخط نہیں کئے (سیاست وطنی ص ۱۲۴)

۱۹۳۷ء: اس سال میں تو کانگریس نے مسلمانوں کے وجود ہی سے انکار کردیا، کہاں کا اتحاد اور کہاں کا ملاپ"۔

۱۹۴۰ء میں ہندوستان میں "مرکزی حکومت قائم کرنے کی تجویز آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں منظور کی تاکہ اس طرح ایک دوامی اتحاد ہو جائے اور دونوں قوموں کو ترقی کرنے کا موقع حاصل رہے، اس طرح ہندوستان آزادی کی منزل سے بہت قریب ہو جائے گا اس تجویز کو عرف عام "تجویز پاکستان" کہتے ہیں مسلم لیگ نے جو یہ حالیہ کوشش اتحاد کی شروع کی ہے تو

اس کا جواب "ہندو لیگ" کا قیام "انٹی پاکستان کانفرنس" "آزاد مسلم کانفرنس" دہلی اور ہندو اخبارات کے انٹی پاکستان نمبر سے دیا جا رہا ہے، اگر یہی لیل و نہار ہیں تو جزیرہ نمائے ہند کو ایک زبردست خون ریز خانہ جنگی سے گذر کر پاکستان کی منزل تک پہنچنا پڑے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلافات تو ازل سے ہیں لیکن سیاسی چپقلش تقریباً ۸۰ سال سے پیدا ہو گئی ہے، اب اسے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا چاہئے، چاہے اس کے لئے مسلمانوں کو بڑی سے بڑی قربانی کرنی پڑے۔

عبدالقدوس ہاشمی

اسلامی ہندوستان کا سنگ بنیاد

خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء

حکیم الاسلام حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خطبۂ صدارت جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سالانہ بابتہ سنہ ۱۹۳۰ء میں بحیثیت صدر منتخب بمقام الہ آباد پڑھا تھا۔

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خطبہ خاصا طویل ہے، اور اس وقت کے اہم مسائل مثلاً گول میز کانفرنس، مسئلہ علیحدگی سندھ اور اصلاحات صوبۂ سرحد پر بھی اس میں حکیمانہ بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ ہمارے موضوع کو ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ہم خطبہ کا صرف وہ حصہ شریک کتاب کرتے ہیں جو مسلمانان ہند کے سیاسی مستقبل سے متعلق ہے اور جس میں علامہ نے وفاقی یا وحدانی حکومت کو ہندوستان کے لئے غیر مفید ثابت کرتے ہوئے ہندوستان کے اندر ایک "اسلامی ہندوستان" بنانے پر زور دیا ہے خوش قسمتی سے یہ حصہ خطبہ کا ابتدائی

حصہ ہے اس لئے آپ ربط کلام سے محروم ہوئے بغیر منشا کلام کو پا سکتے ہیں۔

یہ خطبہ صرف اسی کا مستحق نہیں کہ آپ اسے سرسری طور پر پڑھ لیں بلکہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت جب کہ مسلمانان ہندوستان کی کشتی ذہنی خلفشار کے بحر ناپیدا کنار میں پڑی ہوئی تھی اور نظر کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اپنے اس خطبہ کے ذریعہ ساحل کا راستہ بتایا ہے، اسے روشنی کا بلند مینار سمجھئے جس کو مدنظر رکھ کر یہ کشتی سلامتی کے کنارے پر پہنچ سکتی ہے۔

یہ خطبہ اس "اسلامی ہندوستان" کے خیال کا سنگ بنیاد ہے جو عام طور پر تحریک پاکستان کے نام سے مشہور ہے۔ "مرتب"

اسلام اور قومیت Nationalism

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاست مدن کا مجموعہ ہے (اس سے میری مراد ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہے۔ جو ایک خاص ضابطہ قوانین کے ماتحت ہو اور جس میں ایک مخصوص اخلاقی تخیل کی روح کار فرما ہو) مسلمانان ہند کی تاریخ حیات میں سب سے بڑا جزو ترکیبی رہا ہے، اس نے

وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کئے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انھیں ایک متمیز اور معین قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما ہوا ہے، دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظام ترکیبی نے سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی ہے وہ صرف اس امر کی رہین منت ہے، کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے۔ جس کا محرک ایک مخصوص اخلاقی تخیل ہے، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قلبی یکجہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ اُن آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے۔ جن کا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے، لیکن وہ خیالات جو مفکرین یورپ نے دنیائے سیاست میں پھیلائے ہیں وہ ہندی وغیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمح نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں، ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لئے مضطرب ہو رہے ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں ان خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ ان حقائق پر

کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے۔ جو یورپ میں ان خیالات کے ارتقار کا باعث ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسیحیت صرف تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جس نے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کر لی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دنیائے معاملات کے کسی نظام مدنیت کے خلاف۔ اس لئے کہ عیسائیت کو تو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں، بلا شبہ لوتھر اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ مگر میرے نزدیک اس نے، اس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اس بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ حضرت مسیحؑ کا عالمگیر نظامِ اخلاق کاملاً تہ و بالا ہو جائے گا اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اس کی جگہ لے لیں گے۔ رُوسو اور لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کے ایسی کثرت میں تبدیل ہو گئی، جس کے مختلف اجزا میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیت کا ایک ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیت کا یہ تصور کسی محسوس بنیاد مثلاً عقیدۂ وطنیت پر ہی قائم ہو سکتا تھا اور اس کا اظہار ایسے مختلف نظامہائے سیاست کے ذریعہ سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشو و ارتقار

حاصل کر سکتے ہوں وہ خطوط جو صرف اس اصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اس کا تعلق کاملاً اگلے جہان سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا، حضرت مسیح کے عالمگیر اصول اخلاق کی جگہ قومیت کے نظریۂ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اس تخریب و تعمیر اور رد و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے اور انسان کی دنیاوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام، وحدت انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے اس کے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جسے کسی ایسی مقدس دنیا کے حصول کی خاطر تیاگ دینا پڑے جو اس دنیا سے الگ کہیں اور واقع ہے اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اُس صورت کا نام ہے جو زمان و مکان کے لباس مجاز میں جلوہ فرما ہے یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح و مادہ کی ثنویت (Duality) کا خیال اخذ کیا۔ اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ آج یورپ کے بہترین مفکر تو اپنی ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے سیاسی مدبر

غیر محسوس طور پر دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اندھا دھند اس غلطی کو ایک ایسے عقیدہ کی حیثیت سے قبول کرے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی وہ غلط تفریق ہے جو یورپ کے مذہبی اور سیاسی افکار پر اس نہج سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اُس نے یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے۔ جسکی وجہ سے یورپ ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بن کے رہ گیا، جن کے سر میں انسانیت کا سودا نہیں۔ بلکہ اس پر قومیت کا بھوت سوار ہے یہ بے جوڑ نیشنل سلطنتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد ایک متحدہ یورپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں یعنی پھر اسی وحدت احساس جسے مسیحی کلیسا کے نظام نے ابتدا میں ان کو دیا تھا لیکن انھوں نے بجائے اِس کے کہ حضرت مسیح کے عالمگیر اخوت انسانی کے تصور کی روشنی میں اس کی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متاثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ اسلام میں یورپ کے ازمنہ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام ہی موجود نہیں جو اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بلا رہا ہو۔ دنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظام سیاست موجود ہے بنیادی اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے، ان بنیادوں پر

جو عمارت قائم ہے، وہ البتہ ضروریات زمانہ کی اقتضاء کے مطابق ایک نئی روح کی محتاج ہے اور اس احتجاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہا (واضعین قوانین) دنیائے جدید کے داعیات سے متمسک نہیں ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ دنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصور کا انجام کیا ہوگا یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اس کو اپنے اندر جذب کر کے اس کی ترکیب کو بدل دے گا، جیسا کہ یہ اس سے قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی نوعیت کو بدل چکا ہے یا خود اسلام اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو یکسر تبدیل کرے گا۔ حال ہی میں مجھے لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر وین سنک (Wen Sinck) نے لکھا تھا کہ:۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس وقت اسی نازک دور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت پر ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے طاری ہے، سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم و قیانوسی غلط تصورات کی عمارت تو منہدم ہو جائے، لیکن مذہب کی بنیادیں محفوظ رہیں۔ میرے لئے تو یہ ممکن نہیں کہ میں بتا سکوں کہ اس بحران میں مسیحیت کا انجام کیا ہوگا، چہ جائے کہ میں یہ کہہ سکوں کہ

اسلام پر اس کا کیا اثر ہو گا۔"

اور موجودہ دور میں تو ہو یہ رہا ہے کہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے سطح نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ ابھار رہا ہے۔ جو ان مساعی حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنھیں شرف انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا اور نسل پرستی کے اس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظام حیات کے متعلق ایسے نظریے اور معیار قائم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریاتِ زندگی سے مختلف ہوں بلکہ ان سے متصادم ہو جائیں مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے اس بظاہر علمی بحث Academic discussion سے معذور سمجھیں گے آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو نگہ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دیگا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی

تقدیر کسی کے ہاتھ نہ ہو گی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہو گا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں، ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آج کل اسے درپیش ہے (اس میں شک نہیں کہ) ہر ایک قوم اس بات میں مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم، تاویل یا تنسیخ کر لے لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اس کے لئے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کر لے۔ اس اہم مسئلہ کو جس پہلو سے میں دیکھ رہا ہوں اس سے کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ میں ان حضرات سے جو مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، آمادۂ پیکار ہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے اور میرا یقین ہے کہ اس کے افراد اسلام کی روح اور اس کے نصب العین سے قلبی تعلق کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں تو صرف یہ چاہتا

ہوں کہ موجودہ صورت حال کے متعلق جس چیز کو میں نیک نیتی کے ساتھ صیح سمجھتا ہوں اس کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کردوں۔ صرف یہی وہ طریق عمل ہے جس کی رو سے میرے لئے یہ ممکن ہے کہ میں اپنی بصیرت کی روشنی میں آپ حضرات کے سیاسی مسلک کو واضح کرسکوں

قومیّت ہند کی وحدانیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور اس کے مالہٗ و ماعلیہ کیا ہیں؟ **کیا مذہب سچ مچ ایک نجی معاملہ ہے؟** کیا آپ اس امر کو پسند فرمائیں گے کہ بہ حیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نظریہ کے اسلام کا بھی دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو جو اس سے پہلے عیسائیت کا یورپ میں ہوچکا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے، کہ ہم اسلام کو ایک اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے تو باقی رکھیں لیکن ایک نظامِ سیاست کی حیثیت سے اس کو رد کرکے اس کی جگہ وہ قومی (National) نظام ہائے سیاست اختیار کرلیں جن میں مذہب کو کسی قسم کی دخل دہی کی اجازت نہ ہو؟ یہ سوال ہندوستان میں ایک خاص اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ ایک یورپین کی زبان سے تعجب انگیز نہیں کہ مذہب ایک نجی اور انفرادی چیز ہے۔ یورپ میں

عیسائیت کا تصور ایک کیش رہبانیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مادی دنیا کو ترک کر کے تمام توجہات صرف روحانی دنیا پر مرکوز کر دی جائیں اس کیش کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا جو مذکورہ بالا دعوے میں بیان کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے) لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات وکیفیات روحانی (Religious experiences) کی جو نوعیت قرآن مجید سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کیفیات وواردات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخص متعلقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول ان سے کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ یہ ایسی کیفیات ہیں کہ ان کا مہبط تو قلب انسانی ہو۔ لیکن ان سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آ جائے۔ ان کیفیات کا فوری ماحصل یہ ہوتا ہے کہ ان سے ایک خاص نظام تمدن کے اصول اساسی مرتب ہو جاتے ہیں جو آئینی تصورات (قوانین وضوابط) کا ایک جہانِ خاموش اپنے آغوش میں لئے ہوتے ہیں۔ اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لئے کم نہیں ہو سکتی کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو رد کر دیا جائے تو دوسرا

خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ بنا بریں قومیت کے خطوط پر کسی ایسے نظام تمدن کی تعمیر جو وحدت اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو مسلمان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اس وقت براہ راست مسلمانان ہند کے درپیش ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ:-

"انسان نہ تو اس کی نسل اور مذہب کا غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دریاؤں پہاڑوں کی حدود بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں۔ بلکہ صحیح الدماغ اور گرم جوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے "قوم" کہتے ہیں"

اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لئے ایک طول طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا جس میں یوں کہیئے کہ انسانوں کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انھیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں کبیر کی تعلیم اور شہنشاہ اکبر کا دین الٰہی عوام کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اپنی اپنی انفرادی جزئیات کو ایک عظیم الشان "کُل" میں فنا کر دیں اور یوں قطرات سمندر میں مل کر

سمندر بن جائیں)۔ ہر گروہ اپنی جماعتی ہستی قائم رکھنے کے لئے بضد ہے۔ اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریۂ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوام ہند اسے ادا کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ لہذا ہندوستان میں اتحاد قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہئے صحیح تدبّر کا تقاضا یہ ہے کہ حقائق خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ ان سے چشم پوشی نہ کی جائے حصول مقصد کا عملی طریقہ یہ نہیں۔ کہ جس صورت حالات کا وجود ہی نہ ہو اسے خواہ مخواہ موجود فرض کر لیا جائے بلکہ یہ کہ حقائق جس انداز میں ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتی الوسع بہترین استفادہ کیا جائے ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر حقیقتاً اسی بات پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں اتحاد قومی کو ان ہی راستوں سے تلاش کیا جائے۔

ہندوستان بجائے خویش ایک چھوٹا سا "ایشیا" ہے اس کے باشندوں کے ایک حصہ کا کلچر اقوام شرق کے کلچر سے ہم آہنگ ہے۔ اور دوسرے حصہ کا کلچر وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کلچر کے ساتھ۔ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراک عمل کا کوئی موثر اصول دریافت کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری نا قابلیت

کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر کارگہ تاریخ میں اپنے محل وقوع کی وجہ سے مدت دراز تک مصیبت وابتلار کی آماجگاہ رہی ہے۔ امن وامان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی اور اسکے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یک جہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریق مقابل پر تغلب وتسلط حاصل کرلیا جائے۔ یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراک عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں انا الموجود ولاغیری کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ دعاوی کو

دیکھو تو حب الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات" اور "قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشو و نما کر سکے۔ بہر حال ہماری ناکامی کے وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگ بنیاد تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطن عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہو گی کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشو و نما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہو گا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشو و ارتقار کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور ان کے اقسام میں

بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے۔ وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم وشعائر۔ قوانین وضوابط مذہبی ومعاشرتی ادارات کا بیحد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہوجاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے۔ اور جس نے اپنے مذہب اپنے لٹریچر۔ اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنادیا ہے۔ اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔ ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدروقیمت کو تو نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ فرقہ وار صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین

تصور کے منافی ہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظام حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو اسی طرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن (کلچر) کی بنیادوں پر اپنے نظام زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایک ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آ سکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی کلچر بن جاتی ہے"۔

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یورپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں ان کے نظریہ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی

جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یوروپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے، کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند Muslim India کو معرض وجود میں لایا جائے۔

"دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انھیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشو و نما کر سکیں اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ "کل" کی تخلیق ہو۔ اور مجھے یقین واثق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا، جو ندکورہ قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو

ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے (ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے۔ یا اس سے باہر کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی، لیکن اس نے اس کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ایک ایسی ریاست معرض وجود میں آجائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کا یہ تعلق ہے کمیٹی کی یہ رائے صحیح ہے لیکن بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں میں سے بھی چھوٹی ہو گی اگر قسمت انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائے گی۔ اور اس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائے گا۔ جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائے گا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اس قابل ہو جائے گی کہ وہ اپنے علاقہ کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو موثر تحفظات دے سکے۔ اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیے اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس

ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دیگا۔ اس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور انکا جذبہ حب وطن اور بھی زیادہ ہو جائے گا جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوں گے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر و سنان کا ہجوم ہندوستان کی بہترین مدافعت کر سکیں گے، پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فی صدی ہے لیکن ہندوستانی فوج کا چون ۵۴ فیصدی حصہ انہیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ انیس ہزار گورکھے علٰحدہ کر دیئے جائیں جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصدی ہو جاتی ہے۔ اس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی شامل نہیں ہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہندوستانی

فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اس سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے کے لئے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے۔ میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشو و ارتقاء کا موقعہ ملے اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہ ہونا چاہئے کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظام حکومت کی ترویج ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی

عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام "خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظام حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عمل خیر کو اپنے اندر جذب کر لے اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کہ دنیا میں کسی رُوسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطہ زمین سے منسوب کر دیا۔ اور کبھی اس سے بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدرو قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو، وہ اُس مشینری کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام حکومت کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے "ٹائمز آف انڈیا" کا وہ مقالۂ افتتاحیہ پڑھنا چاہیئے جو جریدۂ مذکور نے آج سے کچھ عرصہ

بیشتر انڈین بنکنگ انکوائری کمیٹی کے متعلق لکھا تھا۔ ٹائمز لکھتا ہے۔

"قدیم ہندوستان میں حکومت کی طرف سے شرح سود متعین کرنے کے لئے قوانین وضع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس شرح سود پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی،[1] باوجودیکہ اسلام میں رقوم قرضہ پر سود لینا صاف طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے"۔

لہذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانان ہند دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ اس سے اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہوگا اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں۔ ان سے مخلصی حاصل کرے۔ اور اپنے شرعی قوانین اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم کر کے انھیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے۔

---

[1] یعنی جو غیر مسلم سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی شرح سود پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ حالانکہ حکومت کے مذہب میں سود حرام تھا۔

فیڈرل ریاستیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ چونکہ ہندوستان میں آب ہوا نسل۔ زبان معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگون اختلافات ہیں اسلئے یہاں کسی محکم دستوری نظام کیلئے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں زبان۔ نسل۔ تاریخ۔ مذہب کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں۔ سائمن رپورٹ نے فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین انتخاب عام سے مرتب نہ کی جائے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہو۔ نیز سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سر سے اسی اصول پر تقسیم کیا جائے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سائمن کمیشن کی ان سفارشات کی میں پوری پوری تائید کرتا ہوں۔ لیکن اسکے ساتھ میں اس اضافہ کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ صوبوں کی جدید تقسیم دو شرطوں کے ماتحت ہونی چاہیے۔ اول یہ کہ یہ تقسیم جدید دستور کے نفاذ سے پہلے ہو جانی چاہیے اور دوسرے اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس سے آئے دن کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے اگر صحیح طریق پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آ گئی تو ہندوستان

کے آئینی مباحث میں سے جداگانہ اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا کیونکہ صوبہ جات کی موجودہ ترکیب ہی موجودہ مناقشات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ہندو کا خیال ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے، قومیت کا جو تصور اس نے قائم کر رکھا ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ کسی جماعت کا جداگانہ انفرادی تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حالات موجود نہیں۔ اور نہ اس کا ہونا مناسب ہے ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا ملک ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی، تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص ان کا لاتعداد قرضہ۔ صوبوں میں ان کی ایسی ناکافی اکثریت جو کسی وقت اقلیت میں بدلی جا سکتی ہے اگر ان امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ پر بالکل واضح ہو جائے گا کہ ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ایسے ملک میں اور ایسے حالات کے ماتحت فیڈریشن میں اگر اقوام کی نمائندگی کی بجائے صوبوں کی نمائندگی ہو تو اس سے ہر ایک طبقہ کے مفاد کی صحیح صحیح نمائندگی نہیں ہو سکے گی اور اس کا لازمی نتیجہ

یہ ہوگا۔ کہ زمام حکومت چند افراد کے ہاتھ میں (Oligarchy) رہے گی۔ ہاں! اگر موجودہ صوبجاتی تقسیم کی بجائے ہندوستان کی جدید تقسیم مختلف قوموں کی لسانی، نسلی، تمدنی "کلچرل" اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر کردی جائے تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ فیڈریشن میں بجائے مختلف اقوام کی نمائندگی کے مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل حکومت کے اختیارات کا تعلق ہے جو نظام حکومت ہندوستانی پنڈتوں (یعنی نہرو رپورٹ) اور "انگلستانی پنڈتوں" (یعنی سائمن رپورٹ) نے تجویز کیا ہے اس کی پشت پر جو جذبات کارفرما ہیں۔ ان میں ایک ایسا باریک فرق ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ "ہندوستانی پنڈت" مرکز کو بحالت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں (یعنی وہ فیڈریشن کی بجائے یونیٹری Unitary کی شکل کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مرکزی اسمبلی کے ہاتھ میں ہو جسے وہ بصورت

موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ نامزدگی (Nomination) کا سلسلہ ختم ہو جانے پر مرکزی اسمبلی میں ان کی اکثریت اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جائے گی، برعکس اس کے چونکہ "انگلستانی پنڈت" یہ محسوس کراتے کرتے ہیں کہ مرکز کی جمہوریت ان کے مفاد کے خلاف جائے گی اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو جو اختیارات آج ان کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ بھی ان سے چھن جائیں گے۔ اس لئے وہ جمہوری نظام کو مرکز کے بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بلاشبہ وہ فیڈریشن کے اصول کی ترویج کر رہے ہیں اور چند تجاویز کی رو سے انھوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا ہے لیکن جن مقاصد کے پیش نظر اس اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ ان مقاصد سے بالکل مختلف ہیں جن کے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں مسلمان فیڈریشن کا مطالبہ اس لئے کرتے کہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کا مشکل ترین عقدہ یعنی فرقہ دار مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن شاہی کمیشن (Royal comission) کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولاً کتنا ہی درست و محکم کیوں نہ ہو اُن کی غرض و غایت

یہ معلوم نہیں ہوتی کہ فیڈرل ریاستوں کو مکمل طور پر خود مختار کردیں حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے برطانیہ کے لئے جو صورت حالات پیدا ہوگی۔ اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکل آئے۔ انھیں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوئی فکر ہی نہیں اس لئے وہ اسے جوں کا توں چھوڑ رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے سائمن رپورٹ فیڈریشن کے اصول کی اصلی ماہیت کو ہی رد کر رہی ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین اس چیز کو بھانپ کر کہ مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہوگی وحدتی نظامِ حکومت (Unitary form of Gov.) کی تجویز پر آگئے ہیں کیونکہ اس نظامِ حکومت کی رُو سے ہندوؤں کو سارے ہندوستان پر عام غلبہ واقتدار حاصل ہوجائے گا۔ سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اہل برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دستکش نہیں ہونا چاہتے جو انھیں آج تک حاصل رہا ہے اور کچھ اس لئے کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو تو اہل برطانیہ کو بہانہ مل جاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں۔ جہاں تک

وحدتی نظام حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابل التفات ہی نہیں باقی رہی فیڈریشن تو وہ اس قسم کی ہونی چاہیے کہ اس میں باقیماندہ اختیارات (Residuary Powers) کلیتہً خودمختار ریاستوں کے ہاتھ میں رہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف انہی اختیارات کے استعمال کی اہل ہو جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اس کی تحویل میں دیدیں میں مسلمانان ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل۔

خطبۂ صدارت ۱۹۴۰ء

قاعد اعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ خطبۂ صدارت جو موصوف نے اجلاس لاہور میں بتاریخ ۲۲ ۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء فی البدیہہ دیا، اس خطبہ میں قاعد اعظم نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت کی بجائے دو مرکزی حکومت کی ضرورت ہے خطبہ کا وہ حصہ درج کیا جاتا ہے جس میں آئندہ دستور ہند کی نسبت مسلمانوں کے رجحانات کی وضاحت کی گئی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ آئندہ دستور ہند کی نسبت مسلمانوں کے رجحانات کیا ہیں؟ مسلم لیگ کا مطالبہ ہے کہ جس قدر جلد حالات اجازت دیں یا زیادہ سے زیادہ اختتام جنگ کے معاً بعد ہندوستان کے آئندہ دستور کے مسئلہ کی از سر نو جانچ پرتال کی جائے اور دستور ہند سنہ ۱۹۳۵ء کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے ۔ حکومت برطانیہ سے اعلان یا بیان کی التجا کے ہم قائل نہیں کیونکہ اس نوع کے اعلانات محض بے سود ہیں ۔ بیانات کا مطالبہ کر کے آپ حکومت برطانیہ کو ہندوستان سے

باہر کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مجلس دستور ساز کانگریس نے وائسرائے سے درخواست کی کہ:-

"وہ ہندوستان کی آزادی کا فوراً اعلان کر دیں اور کانگریس کو مجلس دستور ساز کے ذریعہ جو ممکنہ وسیع تر حق رائے دہی کی اساس پر منتخب ہو دستور مرتب کرنے کا حق عطا کیا جائے اس قسم کی مجلس دستور ساز یقیناً اقلیتوں کے جائز مفاد کی حفاظت کرے گی"۔

گاندھی جی کہتے ہیں کہ اگر اقلیتیں مطمئن نہ ہو سکیں تو امور مابہ النزاع کو فیصلہ کی غرض سے غیر جانبدار ثالثی کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ یہ تجویز ناقابل عمل ہونے کے علاوہ، تاریخی و آئینی حیثیت سے یہ مطالبہ ہی مضحکہ خیز ہے کہ حکمران طاقت مجلس دستور ساز کے حق میں اپنے حقوق فرمانروائی سے دست بردار ہو جائے۔ ان سارے حقائق سے قطع نظر بالفرض اگر ہم اس طریقہ رائے دہی سے متفق نہ ہوں جس کی اساس پر مجلس کا قیام عمل میں آئے اور اگر مجلس دستور ساز میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت غیر مسلم اکثریت سے اختلاف کرے تو ان مشکلات کا حل کیا ہوگا؟ کہا جاتا ہے کہ مجلس دستور ساز اس وسیع براعظم کے لئے قومی دستور کی تدوین میں جو کچھ کرے ہمکو اس سے اختلاف کرنیکا کوئی حق حاصل نہیں

بجز ان امور کے جو اقلیتوں کے تحفظ کے مغائر ہوں اس طرح ہمیں صرف
اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کی حد تک اختلاف کی مراعات
عطا کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے
روانہ کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ یہ تجویز اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ جیسے
ہی دستور عملاً نافذ ہو جائے برطانوی حکومت کا وجود باقی نہ رہے گا
اگر ایسا نہیں ہے تو یہ سب بے معنیٰ ہے' اس تجویز میں برطانوی حکومت
سے مسٹر گاندھی کے مطالبات کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے اس امر کا اعلان
کیا جائے کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اور اس کا تصفیہ کہ وہ اس کا نیا معاوضہ
دینے والے ہیں بعد کو ہوتا رہے گا۔ گفتگو کا یہ انداز معلوم کر لینے کے بعد
کیا فی الحقیقت مسٹر گاندھی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آزادی
ہند کے خواہشمند ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت باقی رہے
یا نہ رہے لیکن وسیع اختیارات عوام کے حق میں یقیناً منتقل ہو جائیں گے
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجلس دستور ساز کی اکثریت اور مسلمانوں کے
مابین اختلاف پیدا ہو جائے تو ثالثی مقرر کرنے کا حق کس کو دیا جائیگا؟
اگر بفرض محال ایک متفقہ ثالثی کا امکان پیدا ہو جائے اور مختلف فیہ امور
کا تصفیہ بھی صادر ہو تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس امر کی نگرانی کون
کرے گا کہ بموجب شرائط منظورہ فیصلہ روبہ عمل لایا جا رہا ہے کیونکہ

ہم سے تو یہ بیان کیا جارہا ہے کہ برطانوی حکومت جزاً یا کلاً اپنے اختیارات سے دست بردار ہو جائے گی پھر لفاذ فیصلہ کے لئے کونسی طاقت کام کرے گی جواب یہی ہے کہ ہندو اکثریت برطانوی سنگینوں کی مدد سے یا گاندھی جی کے اصول "اہنسا" کے ذریعہ اس غرض کو انجام دے گی، کیا ایسی صورت میں ہم کو اس اکثریت پر بھروسہ ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ ایک ایسے مسئلہ کا تصفیہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک معاشرتی معاہدہ ہے جس پر آئندہ دستور کی بنیاد رکھی جائیگی اور جو نو کروڑ اسلامیان ہند پر اثرانداز ہونے والا ہے عدالتی ثالثی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود کانگریس کی یہی تجویز ہے۔

ارباب کانگریس کے رجحانات چند دن قبل گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس کی تشریح سے قبل میں دوسرے قائدین کانگریس کے بیانات کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں جن میں سے ہر ایک کی آواز دوسرے سے مختلف ہے۔

مسٹر راجگوپال آچاریہ سابق وزیر اعظم مدراس کہتے ہیں کہ:۔

"ہندو مسلم اتحاد کا واحد حل مخلوط انتخاب ہے"۔

یہ ہے عقلاء کانگریس کے ایک رکن رکین ہونے کی حیثیت سے مسٹر اچاریہ کی تشریح۔

اب ذرا بابو راجندر پرشاد کا بیان ملاحظہ فرمائیے، وہ اس سے مختلف ہے، اقلیتوں کے مسئلہ کی نسبت کہتے ہیں کہ: "اگر حکومت برطانیہ ہمارے حق خود انفصالی کو تسلیم کرے تو سارے باہمی اختلافات دور ہو جائیں گے" لیکن یہ اختلافات کس طرح مٹ جائیں گے، اس پر راجن بابو نے کوئی روشنی نہیں ڈالی اس سلسلہ میں مزید ارشاد ہے کہ "لیکن جب تک برطانیہ برسر طاقت ہے اختلافات کا وجود باقی رہیگا۔ کانگریس نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ آئندہ دستور تنہا کانگریس مرتب نہ کرے گی بلکہ سارے سیاسی جماعتوں اور مذہبی ادارہ جات کے نمائندے اس کی ترتیب میں شریک رہیں گے۔ کانگریس نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اعلان کر دیا کہ اس مقصد کے لئے اقلیتیں اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ آپ منتخب کریں حالانکہ کانگریس جداگانہ انتخاب کو لعنت خیال کرتی ہے اس طرح یہ بلالحاظ مذہب و عقیدہ سیاسی ایک نمائندہ جماعت ہوگی جو ہندوستان کے آئندہ دستوری مسائل کا فیصلہ کرے گی۔ اقلیتوں کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے"

بابو راجندر پرشاد کے قول کے مطابق جس لمحہ ہم مجلس دستور ساز میں داخل ہو جائیں گے سارے سیاسی، مذہبی اور دوسرے روابط کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسٹر گاندھی کہتے ہیں:

"میرے نزدیک ہندو، مسلم، پارسی اور ہریجن سب برابر ہیں میں جب قائد اعظم سے گفتگو کرتا ہوں تو غیر سنجیدگی کا مرتکب نہیں ہوا کرتا۔ وہ میرے بھائی ہیں"۔

ہاں صرف اتنا فرق ہے کہ بھائی گاندھی تین ووٹوں کا حق رکھتے ہیں۔ اور میں صرف ایک کا، وہ کہتے ہیں کہ "میرے لئے باعث مسرت ہوگا اگر وہ مجھے اپنی جیب میں جگہ عنایت فرمائیں۔ ایک زمانہ تھا جبکہ مسلمان بھائی کو میرا اعتماد حاصل تھا لیکن میری بدقسمتی ہے کہ آج یہ صورت باقی نہیں ہے میں ان تمام چیزوں کا مطالعہ نہیں کرتا ہوں جو اردو جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ شاید میں سب وشتم کا نشانہ بنایا جاتا ہوں لیکن اس کا مجھے کوئی رنج نہیں۔ اب بھی میرا یہی ایقان ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج کا حصول ناممکن ہے"۔

گذشتہ (۲۰) سال سے مسٹر گاندھی یہی راگ الاپ رہے ہیں آخر میں وہ کہتے ہیں "شاید آپ سوال کریں کہ اس سلسلہ میں میں لڑائی کا ذکر کیوں چھیڑ دیتا ہوں میری لڑائی صرف مجلس دستور ساز کے لئے ہو" غالباً یہ لڑائی برطانیہ سے ہے لیکن میں مسٹر گاندھی اور کانگریس کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کی جنگ ایک ایسے مقصد کے لئے ہے۔

جس کو مسلمان قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، اسے معلوم ہے کہ مجلس دستور ساز کا مطلب صرف ایک اور تین ہے سروں کے شمار سے جو سمجھوتہ ہوگا وہ ہمارے دلوں کو اس طرح ہرگز نہیں ملا سکتا کہ ہمیں باہمی اتحاد کے ساتھ کام کرنے کے قابل بنا سکے یہی وجہ ہے کہ مجلس دستور ساز کا تصور ناقابل قبول ہے اس کے باوجود مسٹر گاندھی کی لڑائی مسلمانوں سے بالکل نہیں ہے، صرف مجلس دستور ساز کے لئے ہے۔ مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ:۔ "وہ مسلمان جو مسلم انتخاب کے ذریعہ مجلس دستور ساز میں داخل ہوں اگر ہندو اور مسلمانوں کے مابین کسی مشترکہ مقصد کے وجود کا انکار کریں تو میں مایوس ہو جاؤں گا لیکن اس وقت بھی میں ان کا ساتھ دے سکوں گا کیونکہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور میں نے اس مقدس کتاب کا کسی قدر مطالعہ کیا ہے"۔

مسٹر گاندھی مسلمانوں کے نقاط نظر معلوم کرنے کے لئے مجلس دستور ساز کے خواہشمند ہیں قیام مجلس کے بعد بھی اگر مسلمان ان سے متفق نہ ہوں تو وہ مایوس ہو جائیں گے لیکن اس کے باوجود ہم سے اختلاف نہیں کرینگے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا باہمی سمجھوتہ کے لئے اظہار اخلاص کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہے؟ میں نے بارہا کہا ہے اور اب بھی اس پلیٹ فارم پر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ مسٹر گاندھی کامل دیانتداری کے

ساتھ کیوں اعتراف نہیں کرتے کہ کانگریس ہندو جماعت ہے اور وہ صرف ہندوؤں کی نمائندہ ہے؟ کیوں نہ مسٹر گاندھی فخر کیساتھ کہدیں کہ:۔ میں ہندو ہوں اور کانگریس کو خالص ہندو حمایت حاصل ہے؟ میں اس حقیقت کے اظہار میں کبھی ندامت محسوس نہیں کرتا کہ میں مسلمان ہوں ہیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایک گورچشم کو بھی اس امر کا اطمینان حاصل ہے کہ مسلم لیگ کو خالص مسلم حمایت حاصل ہے تلبیس اور مکر کی کیا ضرورت ہے؟ سازش کی کیا حاجت ہے؟ حکومت برطانیہ اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے ذرائع اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ عدم تعاون کے اعلان اور سول نافرمانی کی دھمکیاں کیوں دی جارہی ہیں؟ محض مسلمانوں کے اختلاف یا اتفاق کا پتہ چلانے کے لئے مجلس دستور ساز کے لئے کشمکش کیوں جاری کی جارہی ہے۔ وہ ایک ہندو قائد کی حیثیت سے پورے فخر کیساتھ کیوں نہیں سامنے آتے ہیں اور کیوں نہیں مجھے فخر کے ساتھ مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دینے کا موقع دیتے ہیں؟ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے، مجھے صرف اسی قدر کہنا تھا۔

حکومت برطانیہ جہاں تک حکومت برطانیہ کا تعلق ہے آپ حضرات واقف ہیں کہ ہماری گفتگو کا سلسلہ ہنوز ختم

نہیں ہوا ہم نے متعدد مقاصد کے تحت تیقنات کا مطالبہ کیا ہے ایک نقطہ پر ہم نے کچھ کامیابی حاصل بھی کی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے دستور کو ترک کر کے ہندوستان کے آئندہ دستوری مسائل کے از سر نو جانچ پڑتال کا ہم نے مطالبہ کیا تھا ملک معظم کی حکومت کے ایماء سے وائسرائے بہادر نے ۲۳ ر ڈسمبر کو جو جواب روانہ کیا ہے اس کے الفاظ میں آپ کو سنا دینا چاہتا ہوں۔

"آپ کے پہلے سوال کے بارے میں میرا جواب یہ ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے ایماء سے میں نے ۱۳ ر اکتوبر کو جو اعلان کیا ہے اس سے دستور سنہ ۱۹۳۵ء کا کوئی حصہ یا اس کی پالیسی اور بنیادی خاکہ کی جانچ پڑتال باہر نہیں ہے"

دوسرے نقاط پر ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری ہے ان کے منجملہ اہم مباحث یہ ہیں:۔

۱۔ ملک معظم کی حکومت ہندوستان کے دستور مستقبل کے نسبت ہماری رضامندی کے بغیر نہ تو اعلان کرے اور نہ کسی مسئلہ پر کسی جماعت سے ہماری غیبت میں کوئی سمجھوتہ کرے۔

مسلمانوں کی انفرادیت حکومت برطانیہ اپنی دانست میں ہمیں اس امر کا یقین دلانا مناسب سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ اس مطالبہ

کو یقیناً حق بجانب تصور کرے گی کہ نو کروڑ باشندگان ہند کی آئندہ قسمت کا فیصلہ ہم کسی غیر کے حوالہ نہیں کر سکتے ہم اور صرف ہم اپنے بارے میں آخری فیصلہ کا اختیار لینا چاہتے ہیں ہم کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ حکومت برطانیہ بجبر مسلمانوں پر ایک ایسا دستور مسلّط کر دے جس کی وہ توثیق نہ کریں۔ ان حالات کے تحت حکومت برطانیہ کو بجا طور پر مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کو یقین دلا کر کامل امن و اعتماد کی فضا میں ان کی دوستی حاصل کرے حکومت ہمارے اس مطالبہ کو تسلیم کرے یا نہ کرے ہم کو اپنی خدا داد طاقت پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور میں اس پلیٹ فارم سے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی عارضی سمجھوتہ ہماری رضا مندی کے بغیر کیا جائے گا تو ہم مسلمانان ہند اس کی مزاحمت کریں گے اور اس بارہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

مسلمان اقلیت نہیں ہیں

(اس کے بعد قائداعظم نے مسئلہ فلسطین پر بحث کی ہے جسے نظر انداز کر کے وہ حصہ درج کیا جاتا ہے جو دستور ہند سے متعلق ہے) جہاں تک ہماری اندرونی حیثیت کا تعلق ہے ہم اس کا بھی جائزہ لے رہے ہیں باخبر ماہرین دستور یا دستوری مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں نے متعدد تجاویز روانہ کی ہیں لیگ کی جانب سے ایک ذیلی مجلس بھی مقرر کی گئی ہے جو وصول شدہ تجاویز کی

تفصیلات پر غور کرے گی لیکن ایک حقیقت بہت واضح ہے کہ غلطی سے مسلمانوں کو اقلیت تسلیم کیا گیا ہے اور عرصہ دراز سے چونکہ ہم اس غلط تخیل کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے اس کو دور کرنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ مسلمان ہرگز اقلیت تصور نہیں کئے جا سکتے۔ ہر حیثیت سے وہ ایک قوم ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت برطانیہ اور خصوصیت کے ساتھ کانگریس صرف اسی اساس پر گفتگو کرتی ہے، کہ ہم اقلیت ہیں۔

مسلمان ہرگز اقلیتوں میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ انگریزی نقشہ کے اعتبار سے بھی ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں میں مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں مثلاً بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا بہترین حل کیا ہو سکتا ہے؟ ہم اس سوال پر غور کر رہے ہیں اور مختلف تجاویز پر غور کرنے کے لئے مجلس کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ دستور کے سلسلہ میں آخری تجویز جو کچھ بھی ہو میں اپنا نقطہ خیال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اسکی توثیق میں لالہ لاجپت رائے کا وہ خط پڑھ دینا چاہتا ہوں جو مسٹر سی آر داس کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ خط غالباً بارہ یا پندرہ سال قبل لکھا

گیا تھا۔ ایک شخص اندرا پرکاش نامی نے حال ہی میں اسے اپنی کتاب میں شائع کر دیا ہے، اس طرح یہ خط جو پوشیدہ تھا، روشنی میں آگیا۔

لالہ راجپت رائے نے جو ایک تیز فہم سیاستدان اور بڑے ہی کٹر مہا سبھائی تھے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کو سنانے سے قبل یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر سامعین میں سے اگر کوئی ہندو ہوں تو وہ ہندومت کو ترک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ قوم پرستی کا لفظ بازیگران سیاست کا کھلونا بن گیا ہے۔ لالہ جی لکھتے ہیں:-

"ایک اور مسئلہ ہے جس نے ابھی حال میں میرے دماغ کو الجھا دیا ہے اور میں خواہش کرتا ہوں کہ آپ اس پر احتیاط کے ساتھ غور کریں اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ گزشتہ چھ مہینے میں نے تاریخ اسلام اور قانون اسلام کے مطالعہ کے لئے وقف کر دئے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد نہ تو ممکن ہے اور نہ قابل عمل۔ عدم تعاون کی تحریک میں مسلم قائدین کے اخلاص کا اعتراف کرنے کے باوجود میں خیال کرتا ہوں کہ اس نوع کے مسائل میں ان کا مذہب مانع ہے۔"

"غالباً آپ کو وہ گفتگو یاد ہو گی جو میں نے ڈاکٹر کچلو اور حکیم اجمل خاں سے کی تھی اور کلکتہ میں میں نے آپ کے سامنے

دہرائی تھی۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے بہتر کوئی مسلمان نہیں لیکن کیا کوئی مسلمان قرآن کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟ مجھے امید ہے تو صرف یہ کہ شائد اسلامی قانون کے سمجھنے میں میں نے غلطی کی ہو، اور اس سے زیادہ دوسری چیز میرے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتی کہ مجھے اپنی غلط فہمی کا یقین ہو جائے لیکن جو کچھ میں نے سمجھا ہے اگر وہ صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم حکومت برطانیہ کے خلاف تو متحد ہو سکتے ہیں لیکن برطانوی طریقہ پر ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ہم کسی طرح متحد نہیں ہو سکتے۔ یعنی ہم ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قائم نہیں کر سکتے"۔

خواتین وحضرات! لالہ راجپت رائے کہتے ہیں کہ اس ملک کے لئے جمہوری طرز حکومت سازگار نہیں تو وہ بجا اور درست لیکن (۱۸) مہینے قبل اسی صداقت کو بیان کرنے کی میں جرأت کرتا ہوں تو میں تنقیدوں اور حملوں کا نشانا بنایا جاتا ہوں۔ لالہ راجپت رائے (۱۵) سال قبل یہ بات کہتے ہیں کہ جمہوری طریقہ پر ہندوستان میں حکومت نہیں کی جا سکتی۔ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ کانگریس کے نزدیک اس کا علاج یہی ہے کہ ہمیں اقلیت کی حیثیت سے اکثریت کے ماتحت رکھا جائے۔

لالہ جی آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"مجھے سات کروڑ مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن یہ سات کروڑ جب افغانستان، وسطی ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کی مسلح جماعتوں سے مل جائیں تو پھر اس طاقت کی کوئی مزاحمت نہیں ہو سکتی۔ میں پورے اخلاص کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کا یقین رکھتا ہوں مجھے مسلم قائدین پر اعتماد بھی ہے لیکن احکام قرآن وحدیث کی نسبت کیا کہا جائے قائدین ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ کیا پھر ہمیں مایوس ہو جانا چاہیئے؟ مجھے آپ کی دانشمندی سے توقع ہے کہ اس مشکل کا کوئی حل پیدا کریں گے۔"

برطانیہ کی غلط فہمی

خواتین و حضرات! یہ ایک خط ہے جو پندرہ سال قبل ایک بڑے ہندو قائد کی جانب سے دوسرے بڑے ہندو قائد کے نام لکھا گیا تھا لیکن موجودہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس وقت جو خیالات اس مسئلہ کی نسبت میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں، ان کو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ ہندوستان کے مستقبل کی نسبت گذشتہ صدیوں میں برطانوی حکومت، برطانوی پارلیمنٹ، بلکہ برطانوی قوم کی تربیت بعض معین تصورات کے ساتھ

اس تدریجی نشو ونما کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جوان کے اپنے ملکی دستور کی ترتیب وتدوین کا اساس تھی جواب دارالعوام، دارالامراء اور نظام کابینہ کے ذریعہ روبہ عمل آرہی ہے۔ سیاسی مقاصد کے ساتھ جماعتی حکومت کا نظریہ ان کے اپنے تصورات کے اعتبار سے ہر ملک کے لئے بہترین اصول حکومت ہے اور اس نظریہ کی حمایت میں کٹر نسلی اور قومی دعایت نے جو نظرتاً اہل برطانیہ کے لئے مرغوب ہے ان سے اس عظیم الشان غلطی کا ارتکاب کرایا جو حکومت ہند کے دستور ۱۹۳۵ء میں متشکل ہوئے برطانیہ عظمیٰ کے اکابر مدبرین اپنے تصورات میں اس قدر مستغرق ہیں کہ انھوں نے اپنے بیانات میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ توقع ظاہر کی ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف عناصر میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

لندن ٹائمز جیسے موقر جریدہ نے ۱۹۳۵ء کے دستور حکومت ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے مابین اختلاف صرف مذہبی نہیں بلکہ قانونی اور ثقافتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دو بالکل جداگانہ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں بہرحال امتداد زمانہ کے ساتھ توہمات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور ہندوستان ایک قومی وحدت میں تبدیل ہو سکے گا لندن ٹائمز کے بیان کے مطابق ایک قومی وحدت

کی راہ میں مشکلات صرف توہمات ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے مابین روحانی، معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی مستحکم بنیادی اختلافات بڑی خوبی کے ساتھ توہمات سے تعبیر کئے گئے ہیں اور یہ تعبیر نہ صرف جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ ماضی سے بلکہ اسلام کے بنیادی تصورات سے علانیہ اغماض ہے۔ ان اقوام کی نسبت جو ہزارہا سال کی یکجائی کے باوجود آج بھی ایسی ہی مختلف ہیں جیسے عہد ماضی میں تھیں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ محض جمہوری دستور حکومت عائد کر دینے یا غیر موزوں اور ناسازگار برطانوی پارلیمنٹری طریقہ ہائے دستور کے ذریعہ یہ دونوں باہم متحد ہو سکیں گی۔ گذشتہ (۱۵۰) سال سے ہندوستان کے لئے وحدانی طریقہ حکومت کے حصول میں جو ناکامی ہو رہی ہے مرکزی وفاقی حکومت عائد کر کے اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا جس حکومت کی ہیئت ترکیبی میں اس قسم کے عناصر شامل ہوں تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی مختلف اقوام اس کو بطیب خاطر تسلیم کرینگی۔ یہ صرف اس وقت ہو سکے گا جب کہ اس کے پیچھے فوجی طاقت کام کر رہی ہو۔

تقسیم ہند ہندوستان کا مسئلہ بین الفرقی نوعیت کا نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اسی اعتبار سے غور و فکر کا

محتاج ہے تا وقتیکہ بنیادی حقائق معلوم نہ کر لئے جائیں جو کوئی دستور بھی مدون ہو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں کیلئے بھی خطرات پر منتج ہوگا اگر حکومت برطانیہ اخلاص کے ساتھ اہل ہند کے لئے اس مسرت اور شادمانی کی آرزومند ہے تو ہم سب کے لئے صرف ایک ہی راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو خود مختار قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے بڑی بڑی اقوام کو جداگانہ حصوں میں آباد ہونے کا موقع دے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ حصص ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں۔ بلکہ ایسی صورت میں ملک کے طریقۂ حکومت میں ایک دوسرے پر معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے غلبہ پانے کی آرزو اور باہمی رقابت دور ہو جائے گی اور بین الاقوامی معاہدات کے ذریعہ جذبات خیر خواہی پیدا ہوں گے اور وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ کامل ہم آہنگی کے ساتھ بسر کر سکیں گے اسکے علاوہ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کے مابین اقلیتوں کے بارے میں باہمی معاملت کے ذریعہ بڑی آسانی کے ساتھ دوستانہ سمجھوتہ حاصل ہو سکتا ہے جس سے مسلمانوں اور دوسرے اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کا بڑی خوبی کے ساتھ تحفظ ہو سکتا ہے۔

متحدہ قومیت کا خواب یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ ہمارے

ہندو بھائی اسلام اور ہندو مت کی صحیح نوعیت معلوم کرنے
میں کیوں ناکام ہیں۔ یہ صرف مذہبی نہیں بلکہ درحقیقت واضح اور
جداگانہ معاشرتی نظام ہیں۔ ہندو مسلم کو مشترکہ قومیت کے سانچے
میں ڈھالنا محض ایک خواب ہے اور ہندوستانی قومیت کا غلط
تصور اب اپنے حدود سے متجاوز ہو چکا ہے جو ہمارے نت نئے
مصائب کا سبب ہے اور اگر ہم نے بروقت اپنے تصورات
کی نظر ثانی نہ کی تو یہ سارے ہندوستان کی تخریب کا موجب ہوگا
ہندو اور مسلم دو الگ الگ مذاہب، فلسفۂ زندگی۔ معاشرت
اور رسوم و ادبیات سے تعلق رکھتے ہیں نہ وہ آپس میں ازدواجی رشتہ
قائم کر سکتے ہیں اور نہ باہم مل جل کر کھا سکتے ہیں دو مختلف تہذیبوں
سے ان کا تعلق ہے جو متضاد خیالات اور تصورات پر مبنی ہیں۔
حیات کے متعلق دونوں کے نقاط نظر مختلف ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے
کہ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے تاثرات تاریخ کے مختلف مأخذ سے
حاصل کرتے ہیں ان کی رزمیہ نظمیں جدا ہیں ان کے ہیرو جدا ہیں اور
اُن کی روایات جدا ہیں۔ اکثر ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہے۔
دونوں کی فتح و شکست ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔
ایسی دو قوموں کو عددی اقلیت اور اکثریت کے مرتبہ میں ایک ہی

ریاست میں رکھنا عام بےچینی اور اس رشتہ کی شکست وریخت کا موجب ہوگا۔ جس سے اس قسم کی متحدہ حکومت کا نظام وابستہ ہو۔

تاریخ میں ایسی بےشمار مثالیں ملتی ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ، زیکوسلوواکیہ اور پولینڈ کو دیکھئے اس کے علاوہ اور بھی متعدد جغرافی ٹکڑے ہیں۔ جو ہندوستان کے مقابلہ میں بہت چھوٹے ہیں لیکن وہاں کی بسنے والی اقوام کے لحاظ سے مختلف ریاستوں میں تقسیم ہیں جزیرہ نمائے بلقان سات یا آٹھ آزاد ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اور پرتگال واسپین ایک ہی جزیرہ نما میں دو بالکل آزاد حکومتوں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود اتحاد ہند اور متحدہ قومیت کے پردہ میں جس کا ملک میں کوئی وجود پایا نہیں جاتا ایک مرکزی حکومت کے قیام کی کوشش کی جارہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ گذشتہ بارہ سو سال سے اس کوشش میں ناکامی ہوئی ہے اور ہر زمانہ میں ہندوستان ہمیشہ ہندو اور مسلم ہندوستان میں منقسم رہا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ مصنوعی یا نام نہاد اتحاد کی تاریخ صرف برطانوی حکومت کے قیام سے ملتی ہے۔ جس کی بقا ربرطانوی سنگینوں کی مرہون منت ہے لیکن ملک معظم کی حکومت کے حالیہ بیان کے مطابق برطانوی دورحکومت کا اختتام اس ملک میں اس قدر عظیم الشان تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ کہ

مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ یقیناً یہ کوئی معقول بات نہ ہوگی کہ (۱۵۰) سال کی حکومت کے بعد انگریز ہندوستان پر ایسی تباہی عائد کردیں نہ ہندو اور نہ مسلمان اس قسم کی تباہی کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ ہوگا۔

مسلمانوں کا فیصلہ مسلم ہندوستان کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کرسکتا جو ہندو اکثریت کی حکومت کو مستلزم ہو۔ ہندو اور مسلمانوں کو جمہوری نظام کے تحت متحد کرنا اور اقلیتوں پر زبردستی اس طریق حکومت کو عائد کرنا ہندو راج کے مترادف ہے جمہوریت کی وہ قسم جو کانگریس ہائی کمانڈ کا منتہائے مقصود ہے مکمل تباہی کا سامان ہے۔ صوبہ واری دستور حکومت کے ڈھائی سالہ دور کا ہمیں پورا تجربہ ہے اگر پھر اس کا اعادہ ہوا تو خانہ جنگی (Civil war) کا واقع ہونا لازمی ہے۔ گاندھی جی نے سکھر کے ہندوؤں کو مشورہ دیا تھا کہ "تشدد یا عدم تشدد کے زور سے وہ اپنی آپ حفاظت کریں۔ تشدد کا جواب تشدد سے دیں اگر یہ نہ ہو سکے تو ترک وطن پر آمادہ ہوجائیں"۔ اس طرح خانگی فوجیں تیار ہوجائینگی جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے مسلمان ہرگز اقلیت تسلیم نہیں کئے جاسکتے مسلمان ہر حیثیت سے خواہ کسی اصطلاح یا تعریف کے تحت ہو

ایک قوم ہیں اور اس قوم کے لئے اس کا اپنا الگ ملک اور جداگانہ حکومت ہونی چاہئے۔ ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایہ سے امن اور اتفاق کے ساتھ بسر کریں گے۔

ہماری آرزو ہے کہ مسلمان روحانی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اپنی صوابدید اور اپنے خصوصی نصب العین کے تحت اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے کامل ترقی کریں۔ دیانتداری اور کروڑوں افراد ملت کے اہم ترین مفادات کا اقتضا یہی ہے اور ہم پر یہ مقدس فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسا باعزت حل تلاش کریں جو سب کے لئے منصفانہ ہو لیکن بزدلانہ دھمکیوں سے ہم کبھی اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ اپنے معینہ مقصد کے حصول میں ہمکو ہر مشکل کا سامنا کرنے اور ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہونا چاہئے۔

مسلمانوں کی آواز

یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۲، ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی متفقہ تجویز۔

۱۔ کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس، دستوری معاملات کی نسبت، لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی، جو ان کی تجاویز مورخہ ۲۷، اگسٹ، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ستمبر اور ۲۲، اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء اور ۳، فروری سنہ ۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے، توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاقی اسکیم جس کی دستور ہند بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء میں تشریح کی گئی ہے اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہندوستان کے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں۔

۲۔ ملک معظم کی حکومت کی جانب سے وائسرائے بہادر کے اعلان مورخہ ۱۸، اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کی نسبت یہ اجلاس اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت ہند کے دستور بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء کا جہاں تک تعلق ہے اس اعلان کے ذریعہ یقین دلایا گیا ہے کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورت کے بعد دستور پر نظر ثانی کی جائے گی مسلم ہندوستان

اُس وقت تک مطمئن نہ ہو سکے گا جب تک کہ پورے دستوری خاکہ پر از سرِ نو غور نہ کیا جائے اور تاوقتیکہ اس کی بابت مسلمانوں کی رضامندی اور توثیق حاصل نہ ہو جائے کوئی غور کردہ خاکہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

۲۔ قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ غور کردہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ جبتک کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو:۔

جغرافی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے اُن کو جدا گانہ علاقوں میں منقسم کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار ہو

ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت کے لئے اُن ہی کی مشورت سے معین اور موثر تحفظات مہیا کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دستور میں ان کے مؤثر معین اور موثر تحفظات شامل کئے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور

دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کو مشورت کے ذریعہ حفاظت ہو سکے۔

یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ صدر بنیادی اصول کے بموجب ایسی دستوری اسکیم مرتب کرے جس میں ان مختلف مجوزہ ریاستوں کو سارے مسائل مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و رسائل جنگی اور دیگر ضروری امور کا اختیار عطا کیا گیا ہو۔

مسئلہ قومیت

از نسب تعمیر بنیاد امم — با وطن وابستہ تقدیر امم
ملت ما را اساس دیگر است — آن اساس اندر دل ما مضمر است

جدید ہندوستان میں لفظ "قوم" اور "قومیت" Nationalism کو جس قدر آزادی کے ساتھ لیکن اپنے حقیقی معانی سے الگ کر کے استعمال کیا گیا ہے شائد کسی دوسرے لفظ کو استعمال نہ کیا گیا ہوگا۔ کہیں یہ بحث پیدا کی جاتی ہے۔ کہ یہ لفظ عربی لغت میں کیا معنی دیتا ہے، اور کہیں اس تشریح و توضیح میں وقت صرف کیا جاتا ہے کہ قرآن حکیم نے اس لفظ کو کس کس معنی میں استعمال کیا ہے، یہ تمام تحقیقات انیقہ سر آنکھوں پر محنت تحقیق و تلاش کی داد دئے بغیر تو ہم بھی نہیں رہ سکتے لیکن سوال صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو ایک قوم کہنے والے' لسان العرب' قاموس' اور غریب القرآن کے بتائے ہوئے معنوں میں گفتگو فرماتے بھی ہیں یا نہیں؟ ڈاکٹر محمود' پنڈت جواہر لال نہرو' اور گاندھی جی کیا قرآنی زبان' اور اعشیٰ' نابغہ ذبیانی' اور امرئ القیس

کی معیاری عربی میں بات چیت کرنے کے عادی ہیں؟ اور کیا اُردو زبان میں اس وقت یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جو لسان العرب وغیرہ میں لکھے ہوئے ہیں، اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں "کوہ کندن و ہیچ نہ برآوردن" میں مبتلا رہیئے۔ مختصر سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ اردو لفظ "لوگ" "جماعت" اور انگریزی لفظ People کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور ان تمام وسعتوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے جو لفظ People یا اردو لفظ "لوگ" یا جماعت میں موجود ہیں۔

قومیت کے معنی آج کل اردو میں لفظ قوم انگریزی لفظ (Nation) کی جگہ پر بولا جاتا ہے اور لفظ نیشن کے کیا معنی ہوتے ہیں، یہ ان ہی لوگوں سے پوچھئے جن کا یہ لفظ ہے اور جنھوں نے اس کے یہ معنی متعین کئے ہیں۔ لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات (International Relations)" میں قومیت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقتور جاذبے تو دو ہیں، ایک جاذبۂ نسل، دوسرا جاذبۂ دین، لیکن ایک مشترک

لٹریچر سے دلچسپی اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک مقاصد اور حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور موجودہ افراد کو بستہ و پیوستہ رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے"۔ ص ۱۱۷

اس لفظ قومیت کے معنی "انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس"

Encyclopeadia of Religious and Ethics

میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

"قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے ...... ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادت و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے زیادہ اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح

سمجھتے ہیں بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و مؤانست ہوتی ہے، غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی معلوم ہوتا ہے۔

یہ ہیں قوم اور قومیت کے معنی، اور یقیناً اس معنی میں قوم یا قومیت کا لفظ قدیم عربی لغات میں نہیں ملے گا۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ان معنوں میں مسلمان اور مشرکین ایک قوم ہو سکتے ہیں؟ اور کیا ہندوستان میں ایسی قومیت تعمیر کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہے؟

اس کے لئے سب سے پہلے اسلام کا اصول اجتماع معلوم کیجئے آپ نے دیکھا کہ قومیت کے بنیادی روابط میں حسب ذیل رابطے بتائے گئے ہیں:۔

۱۔ وطن۔

۲۔ نسل۔

۳۔ زبان۔

۴۔ جاذبہ دین،

ان کے علاوہ جن رابطوں کا ذکر ہے وہ ان میں سے ایک یا چند کی پیداوار ہیں، جیسے مفاد مشترک، مشترک روایات، اور مشترک مقاصد وغیرہ۔

اسلام کا اصول اجتماع اسلام نے اجتماع کی بنیاد "جاذبۂ دین" پر رکھی ہے، باقی دوسرے تمام روابط کو باطل قرار دیا ہے اس سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، اسی لئے مسلمان کہا کرتا ہے کہ:۔

قوام ملت ما لا الٰہ الا اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ میں جو قوم بستی تھی اُس میں فارس کے سلمان، حبشہ کے بلال، روم کے صہیب، قحطانی سردار، عدنانی شرفا، یمنی تجار سب ہی موجود تھے، اور اس طرح ایک قوم بنے ہوئے تھے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رض کے متعلق فرماتے ہیں، اُن سلمان فارسی رض کے متعلق جن کی نسل علی رض کی نسل سے مختلف، وہ آریائی اور یہ سامی، جن کا وطن ان کے وطن سے مختلف وہ عربی یہ ایرانی، جن کی زبان ان کی زبان سے مختلف وہ عربی بولنے والے اور یہ فارسی جنکی عادات ورسوم ان کی عادات ورسوم سے مختلف وہ عبا وعمامہ پہننے والے شادی بیاہ موت و حیات میں عربی رسوم وعادات کے پیرو، اور یہ جامہ سیلی کے عادی فارسی طور وطریق کے پابند، دیکھئے کہ ان تمام اختلافات کو جاذبۂ دین نے کس طرح محو کردیا ہے فرماتے ہیں، سلمان منا اھل البیت

(مسلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں) صرف مسلمان قوم ہی کے جزء نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں میں سے ہیں۔

اسلام سے قومیت کی جنگ

اس ایک رابطہ کے علاوہ کسی مادی اور حسی رابطہ پر قومیت کی تعمیر کا اسلام مخالف ہے، چاہے اسے کسی قسم کی قومیت سے تعبیر کیجئے لیکن اسلام ان سب کو ایک لفظ "عصبیت جاہلیہ" سے یاد کرتا ہے۔ اسلام جب ظاہر ہوا تو اس کی راہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ تیز کانٹا اسی قسم کی قومیتیں تھیں عربوں کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز جو تھی وہ یہ کہ اسلام ان کے نسبی، اور وطنی مفاخر کی سر بفلک عمارت کو مسمار کر رہا تھا۔ اسلام بنی نوع انسان کے لئے آیا تھا وہ نسل، زبان، وطن اور رسوم کی کسی چہار دیواری کو قائم نہیں رہنے دے سکتا تھا۔ یہود کو اعتراض تھا کہ پیغمبر یہود کی اولاد سے باہر کیسے پیدا ہو گیا۔ ہرقل اور مقوقس عیسائی فرماں رواؤں کو غم تھا کہ آنے والا نبی شام میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ اہل طائف کہتے تھے کہ طائف یا مکہ کے کسی بہت بڑے ذی وجاہت آدمی کو پیغمبری ملنی چاہیئے تھی، قریش ناخوش تھے کہ ہم اپنی عادات و رسوم کو کیسے چھوڑ دیں، ابو جہل کا نوحہ تھا کہ "بنی عبد مناف سے ہم شہسواری، داد و دہش کسی بات میں کم نہ تھے،

اب وہ کہتے ہیں کہ ان کے گھر وحی آتی ہے، خدا کی قسم ہم تو محمدؐ کی تصدیق کبھی نہ کریں گے۔" غرض یہ کہ مشرکین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا عیب یہی تھا کہ:۔

مذہب ِ او قاطع ملک و نسب	از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست	با غلام خویش بر یک خواں نشست
قدر احرار عرب نشناختہ	با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند	آبروئے دودمانے ریختند

یہ بدقسمت نوحہ گری کرتے رہے اور اسلام نے انسانوں کی بنائی ہوئی ان چار دیواریوں کو توڑنا شروع کردیا، اور ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ بنی نوع انسان کو ایک برادری قرار دیدیا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۔ (سورۃ النساء۔۱)	خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، پھر اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنادیا تاکہ تم پہچانے جاؤ۔ مگر اللہ کے نزدیک

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات:۱۳) معزز تو وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

اس طرح نسل کے بت کو پاش پاش کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ نسلی اختلافات محض تعارف کے لئے ہیں، فخر و مباہات کے لئے نہیں ہیں، عزت و شرافت کا معیار نسل، وطن، دولتمندی اور کوئی توارث نہیں ہے بلکہ خود انسان کا عمل اور اس کی پرہیزگاری ہی معیار عزت و کرامت قرار پا سکتی ہے۔

اجتماع اسلامی کی دلکشی اسلام بنی نوع انسان کی بہتری کیلئے آیا ہے اس لئے کسی طرح وطن، نسل، یا زبان وغیرہ کو رابطہ قرار دیکر گروہ بندی اور محدود اجتماع کی تعمیر کو جائز نہیں رکھتا اگر اس طرح کی گروہ بندی اسلام میں جائز قرار پاتی تو عرب سے باہر والوں کیلئے اس میں کوئی دلکشی نہ مل سکتی، عدنانی قبائل کے علاوہ دوسرے قبائل کے لئے اسمیں اپنے لئے کوئی سکون میسر نہ آسکتا اور جن لوگوں کی زبان عربی نہ ہوتی انھیں اسلام کی طرف رغبت بھی نہ ہوتی۔ آج کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھئے جرمن نسل کی سربلندی اور عظمت کا ڈنکہ بج رہا ہے، یہودیوں کو نکالا جا رہا ہے لیکن ہے کوئی یہودی جو اپنی نسل کو چھپا کر وہ عزت و سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کرے جو جرمن نسل کے لئے مخصوص بتائی جا رہی ہے کتنی بڑی بات تھی اپنے کو جرمن نسل سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی، جھوٹی سچی تاریخ بنائی

جا سکتی تھی، لیکن نہیں ایسا کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے ہندوستان میں صدیوں سے برہمنی نسل کے طاہر و اطہر ہونے کا شور ہے کوئی ڈراویڈین آج بھی تیار نہیں کہ غلط نسب نامہ بنا کر اپنے کو برہمن ثابت کردے حالانکہ ہزاروں سال سے مقہور ہے، مظلوم ہے مگر اعلیٰ نسل سے اپنے کو وابستہ کرنا نہیں چاہتا۔

جاپان فاتح ہے، سربلند ہے، قوت و شوکت کا مرکز ہے چین مفتوح ہے، کمزور ہے، ذلیل ہے، مگر اس کے باوجود چین کا کوئی شخص اپنے کو جاپانی کہنے کے لئے تیار نہیں ہے، جاپان کو اپنا وطن قرار دینے میں اسے کوئی دلکشی، اور خوبی نظر نہیں آتی۔

یہی حال زبانوں کا ہے انگریزی کی وسعت، اور ہمہ گیری کو دیکھئے اور تلنگی کی محدودیت اور افلاس پر نظر ڈالئے، اس کے بعد تلنگانہ کے ہزاروں انگریزی دانوں میں سے ایک آدمی ایسا ڈھونڈھئے جو تلنگی کو چھوڑ کر اپنے کو انگریزی سے وابستہ کرنے کے لئے تیار ہو یقین کیجئے کہ آپ کامیاب نہ ہوں گے، کسی انسان کے لئے اپنی مادری زبان چھوڑ کر دوسری زبان اختیار کرنے میں کوئی دلکشی نہیں مل سکتی اسلام نے ان تمام اختلافات اور جماعت بندیوں کو توڑ کر انسانی اجتماع کی بنیاد ایک ”اصول پسندی“ پر رکھی جس میں دلچسپی بھی ہے اور دلکشی بھی

اپنی سادگی، سچائی اور مبنی بر حقیقت ہونے کی وجہ سے مختلف وطنوں، مختلف نسلوں، اور مختلف زبانوں کے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اسطرح نسلی، وطنی، اور لسانی اختلافات کے باوجود انسانوں کو ایک دوسرے کا ممد و معاون بناکر ایک دوسرے کا ہمدرد بنا دیتا ہے، اور ان تمام عصبیات جاہلیہ کو ختم کر دیتا ہے۔ جو نسل وطن اور زبان کے محدود روابط پر قائم ہو کر انسانوں کو انسانوں کا خون پینے پر آمادہ کرتی رہتی ہیں ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسلام تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک مسلمان کسی شخص کی صرف اس لئے مدد کرے کہ وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ ضروری ہے کہ مسلمان تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان "نیکی اور پرہیزگاری میں اعانت کرو، اور گناہ و بے راہ روی میں اعانت نہ کرو۔" کا حکم ہر وقت اپنے سامنے رکھے، وہ کوئی ایسی جتھا بندی نہیں کر سکتا جو دوسرے انسانوں کے حقوق پر دست درازی کرے چاہے وہ دوسرے انسان غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔

موجودہ قومیت کی تنگ ظرفی اب ذرا موجودہ قومیت کی تنگ ظرفی اور محدودیت پر نگاہ ڈالئے، انسان طبعاً یہ چاہتا ہے کہ باہمی تعاون اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کرے

اس سلسلہ میں اس کا واسطہ سب سے پہلے ان انسانوں سے پڑتا ہے جو اس کے گھر میں رہتے ہیں، ماں، باپ، بھائی، بہن وغیرہ، جب ان سے ترقی کر کے اس کی نظر میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے تو قبیلہ سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں ایک نسلی قومیت کی وسعت ختم ہو جاتی ہے، اور انسانوں کو یہ یاد کرایا جاتا ہے کہ "اپنا خاندان اور قبیلہ سب سے اچھا"

دنیا کے ہر انسان کو "اچھا" بن جانے کا فطری حق حاصل ہے، اب ذرا ان تنگ نظر انسانوں سے کوئی پوچھے کہ اگر واقعتاً دنیا اور آخرت کی سربلندیاں، صرف برہمن، نسل کا حصہ ہیں تو اسی دنیا کا ایک دوسرا انسان ان خوبیوں اور سربلندیوں کو کس طرح حاصل کرے، کیا یہ ممکن ہے کہ معزز بنانے کے لئے دنیا کے دوسرے انسانوں کو برہمن نسل میں شریک کر لیا جائے؟

وطنیت اس کے بعد اگر اور وسعت نظر انسانی نے حاصل کی تو وطنیت تک پہنچ جاتی ہے، اس کا دائرہ مکان کی ایک کوٹھری سے لیکر ایک سلطنت کے حدود تک ہو سکتا ہے، اور بس، یہ اس کی انتہائی وسعت ہے، اس سے زیادہ ترقی نہیں ہو سکتی، حالانکہ ایک گز زمین جسے ولادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے

بڑھ کر لاکھوں مربع میل کا ملک بن سکتا ہے، تو اس تنگ نظر کو ساری زمین کے وطن سمجھنے سے کون روکتا ہے۔ یہ محض تنگ نظری ہے کہ وہ اپنے کو کسی پہاڑ یا دریا سے محدود کر لیتا ہے! اور اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے ۔ ؎

اے وطن پاک وطن روح رواں احرار
اے کہ مٹی میں تری بوئے چمن رنگ بہار

مقدس عہد و پیمان کے طور پر مہد سے لحد تک ایسا تنگ نظر انسان دہراتا رہتا ہے ؎

قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا | کہ اے ہندوستان تو جس گھڑی مجھ کو پکارے گا
مری تلوار غیروں کے سروں پر جگمگائے گی | ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

اس تنگ نظر اور تنگ ظرف انسان سے پوچھئے کہ اگر دنیا کے تمام "غیر" تیرے اپنے بننا چاہیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ ہندوستانی دنیا میں سب سے اچھے تو کیا گنگا وجمنا کی مقدس وادیوں کے کنارے سب کو جگہ دے سکے گا! اگر یہ نہیں ہو سکتا اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو گویا ہندوستانیوں کو دنیا کے اور تمام انسانوں کے مقابلے میں ہمیشہ کے لئے صف آرا کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور امن کی کوئی تدبیر ہی نہیں ہو سکتی۔

وطن سے لگاؤ، اور انس کا ہونا تو فطری امر ہے اسلام اس کا مخالف نہیں ہے، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وطن کو رابطہ اور کلمۂ جامعہ قرار دے کر کوئی قومیت اور اجتماعیت پیدا کی جائے، ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف جنگ کے مرادف ہے، اور انسانیت کی اتنی بڑی توہین ہے کہ خدا اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا، دنیا میں اس کا عذاب مسلسل اور نہ ختم ہونے والی جنگوں کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ آنکھیں کھول کر دنیا کی موجودہ صورت حال کا مطالعہ فرمائیے، جاپان کا مقدس "جہاد وطنی" چین کے خلاف، جرمنی کا تصور "عظیم جرمنی" برطانیہ کے خلاف، اٹلی کی "قوم پرستی" فرانس کے خلاف کیا کیا گل کھلا رہی ہے، اور ان میں سے نہ کوئی ظالم ہے اور نہ مظلوم، ہر ایک اپنے اپنے "خدائے وطن" کے لئے جنگ کر رہا ہے، مر رہا ہے، دنیا کی دولت لٹائی جا رہی، جانیں قربان کی جا رہی ہیں، پھر یہ جو کچھ ہو رہا ہے، کسی اصول وضابطہ کے لئے نہیں، کسی بلند تر نظریۂ حیات کے لئے نہیں عالم انسانی کی کسی بہتری کے لئے نہیں، بلکہ صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ عظیم تر اور طاقتور جرمنی کے سامنے دنیا کی دوسری نسلیں سجدہ کے لئے جھک جائیں، برطانیہ کو دنیا کی قسمتوں کے فیصلہ کا حق حاصل رہے، اٹلی قدیم رومن

شہنشاہیت کی حیثیت حاصل کرے اور جاپان کو مشرق کا لیڈر یعنی دو کرتا دھرتا" تسلیم کر لیا جائے'۔ ۵

زیر گردوں آدمم آدم را خورد   ملتے بر ملتے دیگر چرد

فساد کی بنیاد

اب ذرا غور فرمائیے کہ ایسی بدعنوانیاں کیوں ہو رہی ہیں کیا ان ممالک میں کوئی ایک آدمی بھی انسانی جذبات نہیں رکھتا ہے، کیا یہ لوگ سب کے سب درندے ہیں، نہیں ایسا نہیں ہے' ان میں بڑے بڑے اہل فکر موجود ہیں۔ ایسے بھی بہتیرے ہیں جو اپنے اندر انسانی جذبات رکھتے ہیں' اور ایسے بھی موجود ہیں جو موجودہ صورت حال سے لرزہ براندام ہیں، گھبرا رہے ہیں کہ انسانیت کس تیزی کے ساتھ اسفل السافلین کی پستیوں میں چلی جا رہی ہے اس کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتے' ان کا دماغ صحیح فکر نہیں کر سکتا، ان کے اعصاب ماؤف ہو رہے ہیں، یاد رکھئے کہ اجتماع میں انفرادی نفسیات کھو جاتی ہے،' اور صرف وہ قوت جامعہ کام کرنے لگتی ہے، جس کی گیرائی نے مختلف انسانوں کو ایک جگہ' یا ایک مقصد کے لئے جمع کر دیا ہو۔

ان ممالک میں جو قومیت یا اجتماع ہے وہ کسی اخلاقی قوت کے ماتحت نہیں ہے' وہ کسی برتر طاقت کی خوشنودی کے لئے کچھ عمل نہیں

کر سکتی، ان لوگوں نے مذہب کو انفرادی اور پرائیوٹ چیز بنا دیا ہے، اس لئے وہ اجتماعی اعمال پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، اب اس کے بعد اجتماعی اعمال و افکار کا محور یا وطن ہے یا نسل، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا اور ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ جن اعمال سے وطن، اہل وطن، نسل، اور افراد نسل کا مستقبل روشن اور درخشاں نظر آنے کی امید ہو گی وہ اعمال محمود اور قابل تعریف قرار پائیں گے۔ چاہے اس سے دوسروں کے گھر تباہ ہو جائیں یا دوسری نسلوں پر بڑی سے بڑی آفت آ جائے، ان اعمال کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے خلاف کسی کا سوچنا اول تو بہت مشکل اور نادر ہے، اور اگر کسی نے اس کے خلاف سوچکر کوئی عمل کیا تو وہ غدار، گردن زدنی اور لائق صد ہزار نفرین ہو گا۔

آج کل قومیں اجتماعی طور پر جو کارنامہ انجام دیتی ہیں ان میں زبردست قسم کی قومی خود غرضی کام کرتی ہے، اور ایسا ہونا بالکل یقینی ہے، جب اجتماع کی بنیاد کسی نظام ضابطہ، اور اصول پر نہ ہو تو ایسی خود غرضی کو نہیں روکا جا سکتا۔ وزیر ہند نے اپنی تقریر مورخہ ۱۲ اردسمبر ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان پہلے" کہہ کر اسی قسم کی قومیت کی طرف دعوت دی ہے، اُن سے اسی کی امید تھی۔ "انگلستان پہلے" کا ورد مدتوں سے کیا جا رہا ہے اور اس کے خطرناک نتائج سے کون واقف نہیں ہے

اب "ہندوستان پہلے" کا دور اگر ہندوستانیوں نے شروع کر دیا تو بنی نوع انسان کو اسی طرح کے دوسرے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا جن کا مظاہرہ صدیوں سے برطانوی مقبوضات میں ہو رہا ہے۔

قومیت کی تباہ کاریاں یہ ہے موجودہ قومیت (نیشنلزم) کی بنیادی خرابی، اس سے انسانیت کو کس قدر عظیم الشان نقصانات کا اندیشہ ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی محال ہے؟ اسکا ادنی کرشمہ تو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی جنگیں ہیں، آئندہ کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ؎

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اس سے انکار نہیں کہ جنگیں مذہب کے نام پر بھی ہوئی ہیں، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کیا ہے لیکن کبھی آپ نے سنا ہے کہ غیر مصافی آبادی میں قتل عام کیا گیا ہو۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پچھلی تیرہ سو سال کی تاریخ اسلام میں آپ کو ملے گا تو آپ دیکھیں گے کہ وہ واقعہ نادر شاہ افشار اور علاء الدین جہاں سوز جیسے نسل پرستوں کا کارنامہ ہوگا۔ عام مسلمانوں نے کبھی اسے نہیں سراہا۔ اور نہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

آج تو یہ ہو رہا ہے کہ یہ تمام مظالم قومی کارنامے اور "جہاد وطنی"

بنا کر انجام دیے جا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دیکھ سکتے ہیں انکو نظر آ رہا ہے کہ اگر موجودہ قومیت قائم رہی تو تہذیب اسلامی ملیامیٹ ہو جائے گی، علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے اہل یورپ کو مخاطب کر کے کتنا سچ کہا تھا کہ،

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

قوموں میں منافست، مسابقت اور خود غرضی کا جذبہ ترقی کرتا رہتا ہے، یہاں تک یہ آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جاتی ہیں پھر ان کی راکھ سے اسی قسم کی نامحمود قومیت پیدا ہوتی ہے۔ لوگ لرزہ براندام ہیں کہ آخر اس کشمکش کا حشر کیا ہوگا، مسٹر ہیرلڈ جے، لاسکی پروفیسر سیاسات لندن یونیورسٹی نے جو انگلستان میں سیاسیات کے امام سمجھے جاتے ہیں، اپریل ۱۹۳۲ء میں "قومیت اور تہذیب کا مستقبل" کے موضوع پر ایک لکچر دیا تھا' یہ لکچر کنوے میموریل سیریز میں شائع ہوا ہے، سارا لکچر گویا ان خطرات کی پیشین گوئی ہے جو اس جنون قومیت کی بدولت پیش آنے والے ہیں' اس لکچر کے چند آخری جملے آپ بھی سن لیجئے' نیشنلزم کی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:-

"موجودہ دور میں ہماری دنیا بدامنی کے دوامی خطرہ میں

پڑی ہوئی ہے، کیونکہ یہ ایک دوامی کشمکش میں گرفتار ہے، ہمارے سامنے جو خطرات ہیں، ان کے مقابلہ میں صرف بزنیت جا سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ ان خطرات کی بنا پر ہمیں نظم جدید کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔" (ص ۶۱)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں کہ :-

"جیسے ہی کہ قومیت اپنے ہاتھ میں اقتدار لیتی ہے، بین الاقوامی امن کی بنیادوں کے لئے خطرہ بن جاتی ہے۔" (ص ۵۹)

جمہوری خطرات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :-

"جمہوری قومیت سے دنیا کو جو خطرات لاحق ہیں، امن سے عالم انسانی کو محفوظ رکھنا کسی سرمایہ دار حکومت کا مقابلہ کرنے سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔" ص ۵۳

سر رادھا کرشنا مشہور ہندو فاضل اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے امسال (۱۹۴۰ء) جنم اشٹمی کے موقع پر جو تقریر کی اس میں کہتے ہیں :-

"آپ سوال کریں گے کہ جنگ پیدا کیسے ہوتی ہے، سنئے مردوں عورتوں اور بچوں سب کو تعلیم دی جاتی ہے کہ قومی گیت گاؤ، وطن پرستی کے نام سے انھیں سکھایا جاتا ہے کہ دوسری قوموں سے

نفرت کرو، اور نفرت وحقارت کے عام جذبات ان کے خلاف پھیلاؤ، قوم پرستی ایک ایسا خوفناک اور ضرر رسان جذبہ ہے کہ اس نے نسل انسانی پر زمین تنگ کر دی ہے، اسی قوم پرستی سے عداوت اور اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتائج ساری دنیا کو بھگتنے پڑتے ہیں۔"

اتنی کہاں گنجائش ہے کہ یورپ و ایشیا اور امریکہ کے سیکڑوں علماء کے بیانات آپ کے سامنے رکھ دئے جائیں، ورنہ ہندوستان کے قوم پرستوں کو نظر آجاتا کہ قومیت جن کے باغ کا پودا ہے وہ خود بھی اس کی زہرناکیوں سے گھبرائے ہوئے ہیں۔

جمعیۃ اقوام کی نامرادی

دنیا کے عقل و دماغ والے موجودہ تقسیم قومیت سے اس قدر نالاں ہیں کہ بار بار قوموں کا ایک مجموعہ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر قومیت کا موجودہ جنون باقی رہا تو بنی نوع انسان کے لئے ایسی ناپاک دنیا میں ایک منٹ بھی چین و سکون سے زندگی بسر کرنا محال ہو جائے گا۔ اس ضرورت کو پچھلی جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء میں بڑی شدت سے محسوس کیا گیا، اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ جنیوا کی مجلس اقوام کا وجود عمل میں آیا، لیکن ولسن اور اس کے ساتھیوں کی فکر

اس قدر ناپختہ اور عقل اتنی نارسا تھی کہ "مجلس اقوام" کی بنیادیں بھی اسی نامحمود جذبۂ وطنیت کی رہین منت رہیں۔ افراد کی بجائے اوطان کو اس "کل" کا جز قرار دیا گیا، کوئی اخلاقی قوت موجود تھی اور نہ نمائندوں میں جذبۂ انسانیت، سب کے سب اسی "قوم پرستی" اور "وطن پرستی" کے نشہ سے سرشار تھے، وحدت فکر و عمل جو ہر اجتماع کے لئے ضروری ہے مفقود تھا، دماغوں میں خود غرضیاں اپنے آشیانے بنائے ہوئے تھیں، کسی نمائندہ نے کبھی ایک منٹ کے لئے یہ سوچا ہی نہیں کہ اُسے اپنے وطن کے علاوہ ساری دنیا کی بہتری کے لئے کچھ کرنا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ "مجلس اقوام" ایک دن کے لئے بھی وہ خدمت انجام نہ دے سکی جس کے لئے اپنے بانیوں کے قول کے مطابق یہ بنائی گئی تھی۔ کاش ان دشمنان آدمیت کو معلوم ہوتا کہ ؎

برتر از گردوں مقام آدم است　　اصل تہذیب احترام آدم است

اسلام "جمعیت اقوام" کی بجائے "جمعیت آدم" بنانا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانوں کو ایک خاص اخلاقی نظریہ کا پابند کیا جائے، افراد انفرادی حیثیت میں بھی اس کے پابند ہوں، اور اجتماعی میں بھی، اور یہ سودا انسانی دماغ سے نکال دیا جائے کہ اپنے ہم وطنوں یا ہم نسلوں کی برتری کے لئے سب کچھ جائز ہے، بلکہ یہ سکھایا

جائے کہ ظلم بہر حال ظلم ہے چاہے اس سے کسی ملک کے باشندوں یا نسل کے افراد کو بڑے سے بڑا فائدہ پہنچنے کی امید وابستہ ہو۔

اس دور میں اقوام کی وحدت تو ہوئی عام   پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود   اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام   جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

وحدت اصول بلاشبہ اسلام بھی ایک اجتماع اور یگانگی کی دعوت دیتا ہے وہ بھی چاہتا ہے کہ انسانوں کی اس کثرت میں ایک وحدت نمایاں ہو، لیکن ایسی وحدت جس کی بنیاد توحید، خدا ترسی، عدل اور انصاف کے اصول پر ہو جس میں ہر شخص اپنے وطن سے جائز انس، اپنی نسل سے جائز محبت باقی رکھنے کے باوجود شریک ہو سکے، اور پھر اصول پسندی کی خاطر اس طرح وحدت میں گم ہو جائے کہ پہاڑوں اور دریاؤں سے بنائے ہوئے حدود اور نسل و زبان کی تقسیمیں اسکو توڑ کر دوسرے انسانوں کے خلاف صف آرا نہ کر سکیں، اس وحدت میں اتنی وسعت، اتنی لچک اور اتنی گنجائش رکھتا ہے کہ دنیا پر بسنے والا ہر انسان، چاہے وہ زمین کے کسی حصہ کا باشندہ، چاہے وہ کسی نسل کا فرد ہو اور چاہے وہ کوئی زبان بولتا ہو، بنی نوع انسان کی بہتری کیلئے ان اصول حیات کو تسلیم کرلے اور برابر حقوق

و فرائض کے ساتھ اس وحدت میں شریک ہو سکتا ہے۔

تبان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہی باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اس اجتماع و قومیت میں افراد اور مجموعہ دونوں پابند ہیں کچھ ایسے آسمانی قوانین کے جن سے اگر سرتابی نہ ہو تو دوسروں کے خلاف جذبات نفرت و حقارت کی پرورش ممکن ہی نہیں ہے

وطنیت سے جنگ اسلام نے اپنی اس "اصولی قومیت" بنانے کے لئے کس طرح دماغوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کا ایک نمونہ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول میں دیکھا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے متعلق تھا۔ اب ذرا صحابہ کے عام جذبات و حالات پر غور فرمائیے، مکہ مکرمہ میں صحابہؓ زندگی کبسر کر رہے ہیں قرآن کریم نازل ہو رہا ہے، حکم ہوتا ہے کہ دین کے لئے وطن کی محبت کو چھوڑ دو، قربان کر دو، ان تمام جذبات کو جو وطن کے لئے تمہارے سینوں میں موجزن ہیں، صحابہؓ حبشہ اور اس کے بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، وطن چھوڑ دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وطن سے اپنے کو وابستہ نہ کرو۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ۔ کیا نہیں دیکھتے زمین میں جو کچھ ہے سب کو

مسخر کر دیا) کہا جا رہا ہے کہ اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا (کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے) حتیٰ کہ جو دین کے لئے وطن کو قربان نہ کردے اس سے دوستی رکھنے کی بھی اجازت نہیں، ارشاد ہوتا ہے۔ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ اَوْلِیَاءَ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں ان میں سے کسی کو محبوب نہ رکھو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ "جس نے ہجرت نہ کی وہ ہم سے نہیں ہے یعنی" "وہ شخص جو دینی رابطہ میں مربوط رہنا چاہتا ہے اسے وطن کا رابطہ توڑ دینا پڑے گا"

مہاجرین ہجرت کر کے آتے ہیں، اب مدینہ والوں کو دیکھئے کہ ان غیرملکیوں اور بدیسیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، انصار مدینہ میں گھر بار والے ہیں، اور مہاجرین بے خانماں وہ اپنا سب کچھ اللہ کے لئے چھوڑ کر آئے ہیں، ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، لیکن انصار ان کو اپنا بھائی بنا لیتے ہیں، اور صرف منہ بولا بھائی نہیں بلکہ ایسا بھائی جو دوسرے بھائی کی املاک کا شریک اور آیت وراثت کے نزول سے پہلے تک، وارث بھی ہوتا ہے۔ اصول و نظام حیات تمام تفریقوں پر غالب آجاتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد ان ہی انصار و مہاجرین کا لشکر جا کر مکہ کو فتح کر لیتا ہے، اب تو مہاجرین کو دبانے اور ستانے والا کوئی مکہ میں موجود نہ تھا، مگر مہاجرین اس اتحاد کو اب بھی ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے، سب کے سب مدینہ واپس آکر، اسی طرح رہنے لگے جیسے پہلے رہتے تھے۔

عربوں میں وطنی اور نسلی عصبیت تھی اور بہت شدید قسم کی تھی زبان کے بارے میں ان کا غرور تو اس درجہ پر تھا کہ ساری دنیا کو اعجم یعنی گونگی کہا کرتے تھے، لیکن اسلام نے ان سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا، اور آخر میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیام دیا وہ یہ تھا کہ:۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ

زاد المعاد

کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فضیلت نہیں ہے، اگر کوئی فضیلت ہے تو صرف پرہیزگاری کی بنا پر۔

نسل سے جنگ نسلی رشتوں میں سب سے قوی، باپ بیٹا، اور بھائی بھائی کا رشتہ ہے، لیکن اسلام نے دین و ایمان کے لئے، اصول و ضابطہ کے لئے

اسے بھی قربان کر دینے کا حکم دیا۔ حکم دیا جاتا ہے۔

لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَآئَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (التوبہ۔۳)	اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو بھی محبوب نہ رکھو اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو محبوب رکھیں، تم میں سے جو ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں سے شمار ہوگا۔

بارگاہ نبوت سے ارشاد ہوتا ہے۔

یاایھا الناس کلکم من اٰدم و اٰدم من تراب لا فخر للانساب یامعشر القریش ان اللہ اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیہ وتعظمھم الاٰباء	اے لوگو! تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے تھے نسب کی بنا پر کوئی فخر نہیں ہونا چاہیے اہل قریش! اللہ تعالیٰ نے تمھاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بڑائی پر ناز کو دور کر دیا۔

یہ تھے احکام و ارشادات، اب دیکھئے کہ نسل کے اس بت کو صحابہ کرامؓ نے اسلام کے تبر سے توڑ کر کس طرح پارہ پارہ کر دیا۔ ابولہب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نسب، بلکہ قریب ترین ہم نسب ہے، زبان دونوں کی ایک ہے، اور وطن بھی ایک، مگر دونوں ملکر ایک قوم کے اجزا نہیں بن سکتے حضرت ابوبکرؓ اپنے صلبی فرزند عبدالرحمٰن پر تلوار اٹھاتے ہیں، حضرت

حذیفہؓ اپنے باپ پر حملہ کرتے ہیں، حضرت عمرؓ اپنے ماموں کو قتل کر دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے قبیلہ قریش پر فتح مکہ کے دن غیر قبیلہ کے لوگوں کو لیکر چڑھائی کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان کفار قتل ہو رہے ہیں اور کون قتل کر رہا ہے مدینہ کے کاشتکار جن سے رسول اللہ کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے غزوہ بنی المصطلق میں مدینہ کا مشہور قوم پرست عبداللہ بن ابی کہتا ہے کہ مہاجرین کو ہم نے ہی سر چڑھا رکھا ہے، اگلی بار مدینہ پہنچ کر ان سب کو نکال دیں گے، یہ غیر ملکی اور بدیسی بہت پھول گئے ہیں، اس کا جواب اس کے صلبی فرزند حضرت عبداللہؓ یہ دیتے ہیں کہ آگے بڑھ کر مدینے کی راہ پر تلوار کھینچ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس وقت تک باپ کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیتے جب تک بارگاہ رحمۃ اللعلمین سے حکم نہیں آجاتا

صلہ رحم کی تاکید اس سے یہ مطلب نہیں کہ اسلام خونی رشتوں کو تسلیم نہیں کرتا، یا ان رشتہ داروں کا کوئی حق اسلام کے نزدیک نہیں ہے، خدا کی کتاب، رسول کا اسوۂ حسنہ اور صحابہؓ کی زندگیاں گواہ ہیں کہ اسلام صلہ رحم کی تاکید کرتا ہے، ماں باپ کے خلاف "اُف" تک کہنے کو منع کرتا ہے، عزیزوں قریبوں کے ساتھ

سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، صرف اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جن دو انسانوں کو کفر و ایمان نے الگ الگ کر دیا ہو ان کو خون کا رشتہ اور نسل کا واسطہ جوڑ کر ایک قوم بنا دے، حتیٰ کہ مسلمان باپ کے کافر بیٹے کو وراثت بھی نہیں مل سکتی، بہر حال دین اور ایمان ہی بنیاد اجتماع اور بنائے قومیت قرار پا سکتے ہیں، اس کے مقابلہ میں ہر واسطہ اور ہر رابطہ توڑ دیا جائے گا۔

جدید قومیت کی بنیادیں عقل کی کسوٹی پر

موجودہ قومیت کے معانی، اسلامی نظریہ اجتماع اور موجودہ قومیت کے خطرات آپ نے ملاحظہ فرما لئے، اب ذرا غور فرمایئے کہ موجودہ قومیت کی بنیادیں عقل کی کسوٹی پر کھری بھی نکلتی ہیں یا نہیں؟ اور وہ مقصد بھی ان سے پورا ہوتا ہے یا نہیں جو قومیت یا اجتماع کی تعمیر سے پیش نظر ہونا چاہیے۔

لفظ قوم اور قومیت اگرچہ جدید ہیں، لیکن اجتماعِ افراد انسانی اور اس کثرت میں وحدت اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود نسل انسانی، اس وحدت کے پیدا کرنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد باہمی مؤانست و معاونت سے ایک ایسی وحدت پیدا کر لیں جو تمدن کی ان ضروریات کی تکمیل کر سکے جنھیں فرد اپنی یکہ و تنہا کوشش سے پورا نہیں کر سکتا، اس مقصد کی

تکمیل کے واسطے حسب ذیل دو خصوصیت کا اجتماع میں پیدا ہو جانا ضروری ہے ورنہ مقصد فوت ہو جائے گا، اور اجتماع انفرادی زندگی کے لئے عذاب بن کر رہ جائے گا۔

(۱) افراد کے مابین حقوق انسانی میں کامل مساوات۔

(۲) فکر اجتماعی کی غیر منقسم وحدت جو قومی خودی (National Self) پیدا کر سکے

اب ذرا غور سے دیکھئے کہ جن اشتراکات پر موجودہ دور میں قومیت کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ یہ خصوصیتیں پیدا کرتی یا کر سکتی ہیں؟ سب سے پہلے وطن کو لیجئے۔

وطن سے مراد ہے مرز بوم یعنی کسی انسان کے پیدا ہونے کی جگہ، یہ جگہ حقیقۃً دو گز زمین سے زیادہ نہیں ہو سکتی، پہلے پہلے انسان اسے ایک گھر، پھر ایک گاؤں، پھر ایک ضلع، اس کے بعد صوبہ، اور اس کے بعد سلطنت تک وسعت دیتا ہے، یہی دائرے اس کی ساری زندگی میں قائم رہتے ہیں، وہ سارے جہاں سے اپنے ملک اور سارے ملک سے اپنے صوبہ کو، سارے صوبہ سے اپنے ضلع کو سارے ضلع سے اپنے گاؤں کو، اور سارے گاؤں سے اپنے گھر کو عزیز رکھتا ہے، اس جگہ اس کی ساری قومیت گھر کے پانچ چھ آدمیوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، اور اگر وسعت کا خیال کیجئے تو

کوئی عقلی وجہ نہیں ہے کہ وہ ملک یا سلطنت تک آ کر کیوں رک جائے کیوں نہ ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھے،

اگر ہر ضلع کے باشندے اس ضلع والوں کو اپنے اور دوسرے ضلع والوں کو اجنبی اور غیر سمجھنے لگیں تو کیا وحدت فکر اور مساوات باقی رہ جائے گی؟، پھر ایک ہی ضلع میں رنگ و نسل کی جو تقسیم ہو گی اسکا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہندوستان کے کسی گاؤں میں چلے جائیے، ایک ہی گاؤں کے رہنے والوں میں چمار، برہمن، اہیر اور دھوبی کے مابین مساوات نظر آتی ہے؟ پنگھٹ پر پانی لیتے وقت، جاڑوں میں دھوپ کھاتے وقت، گرمیوں میں ندیوں اور تالابوں میں نہاتے وقت کہیں آپ نے مساوات دیکھی ہے؟ ہندوستان کو چھوڑیئے کہ یہاں تو چھوت چھات نے قومیت یا اجتماعیت کا تصور امکان سے باہر کر دیا ہے۔ جرمنی میں یہودیوں کو دیکھئے، امریکہ میں سرخ فام قدیم امریکی باشندوں کو دیکھئے حقوق انسانی میں مساوات برتی جاتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اچھوتوں، یہودیوں اور امریکنوں کو قومیت سے کیا فائدہ پہنچے گا، اور وہ مقصد کیسے پورا ہو جائے گا جو قومیت کی تعمیر سے پیش نظر تھا۔ دوسروں کے دباؤ میں رہ کر کچھ کہنا یا کرنا اور بات ہے ورنہ کیا ان لوگوں نے انفرادی خودی کھو کر اپنے کو قومی خودی میں

گم کر دیا ہے؟ اور کیا انھیں اپنی حالت کا کبھی احساس نہیں ہوتا؟

دوسری حیثیت سے دیکھئے تو یہ ضروری نہیں کہ کسی جغرافی یا سیاسی حدود میں زندگی بسر کرنے والوں میں وحدت فکر بھی موجود ہو، جب ان میں ایمان و اعتقاد کا اشتراک موجود نہ ہوگا تو فکر و عمل ایک کیسے ہو سکتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ کچھ نہ کچھ مشترک مفاد تو ہموطنوں میں ضرور ہوں گے، تو یہ چیز زیادہ سے زیادہ اشتراک پیدا کر سکے گی، نہ وحدت کیسے پیدا کر دے گی، اور کچھ نہ کچھ اشتراک مفاد تو برطانیہ اور امریکہ، اٹلی اور جرمنی میں بھی موجود ہے، اس سے یہ لوگ ایک قوم تو نہیں بن گئے، اس سے آگے دنیا کے تمام انسان بھی کچھ نہ کچھ اشتراک رکھتے ہیں، پھر اسے کیوں نہ قومیت کی بنیاد قرار دیا جائے۔

نسل کو بنیاد قرار دے کر وحدت پیدا کرنیکی کوشش بے رحمی اور نا انصافی پر مبنی ہونیکے علاوہ پانی پر لکیر بنانے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی، دو بھائیوں کے مابین خونی رشتہ کا وجود دونوں کے خیالات، افکار اور نظام حیات میں اتحاد کی دلیل نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ دو حقیقی بھائیوں میں اس قدر بعد المشرقین ہو کہ ان کے مابین وحدت مشترک کی تلاش محال ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک تورانی، دوسرا آریائی، اور تیسرا سامی اس طرح خیالات میں متحد ہوں کہ انھیں ایک دوسرے جدا کرنا

محال ہو جائے۔

نسلی اشتراک اگر صحیح معنی میں دیکھا جائے تو دس بارہ اور زیادہ سے زیادہ بیس پچیس آدمیوں تک تو یہ کسی قدر نمایاں رہ سکتا ہے لیکن اُس دادا کو اصل قرار دے کر اشتراک کی تلاش جس سے اب تک سو دو سو پشتیں گزر چکی ہوں اور اس کی اولاد ایک دوسرے کو دیکھ کر آج پہچان بھی نہ سکتی ہو، عبث ہے۔ ان میں آپ کے وہم کے سوا مشترک کیا چیز رہ جاتی ہے ہندوستان ہی میں مالابار اور چیرا پونجی کے دو برہمنوں کو یکجا بٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کتنا بعد اور تضاد ہے ورنہ یوں تو دور کا اشتراک نسل دنیا کے تمام انسانوں میں موجود ہے، حضرت آدم یا (پرماپرش) کی نسبت سے ان سب کو ایک ہی قوم کیوں نہ بنائیے۔

تیسری چیز زبان ہے، اشتراک لسانی سے یہ فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ باہمی تفاہم میں آسانی ہو، خیالات کا اظہار اور دوسروں کے خیالات کا سمجھنا ممکن ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک زبان کے بولنے والوں میں فکر کی وحدت بھی پائی جائے، ایک ہی خیال دس زبانوں میں ادا کیا جا سکتا ہے اور دس متضاد خیالات ایک ہی زبان میں بھی ادا ہو سکتے ہیں، زبان کا اشتراک افکار کی وحدت پیدا کر سکتا ہے، اور نہ انسانی حقوق میں مساوات، اس سے کوئی وحدت قومی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔

امریکہ میں بھی انگریزی زبان بولی جاتی ہے اور انگلستان میں بھی لیکن ان دونوں کو ملا کر آج کی تقسیم میں ایک قوم نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے ممالک کی غلطی اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قومیت (Nationalism) سے جو معنی آج مراد لئے جاتے ہیں ان معنوں میں قومیت اور اسلام ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور قومیت کی بنیاد جن امور پر رکھی جاتی ہے، وہ عقلاً بھی ایسی وحدت و مساوات پیدا نہیں کر سکتے جو قومیت کی تعمیر اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں، اس سلسلہ میں مصر و ترکی کے حالات سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، غلطی بہر حال غلطی ہے چاہے دنیا کے کتنے ہی لوگ اس میں مبتلا ہوں، اور مسلمان کے سامنے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابۂ کرام کا نمونہ رہنا چاہئے، کسی مصر و ترکی کی اتباع اس کے لئے مفید نہیں ہو سکتی، دنیا کے ہزاروں اشخاص شرابیں پیتے ہیں، اس سے شراب کی برائیاں کم نہیں ہو سکتیں، دنیا کے لاکھوں انسان اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہیں، لیکن اس سے ان خرابیوں کو سراہا نہیں جا سکتا۔

کفار سے تعلقات اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں اور کفار کے مابین تعلقات کیا ہو سکتے ہیں، اس کیلئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کفار بھی انسان ہیں، اور اس سلوک و برتاؤ کے

مستحق ہیں جو ایک انسان کا حق ہے، ان سے مشترک معاملات میں تعاون واشتراک عمل ہونا چاہیئے بلکہ ان کے ساتھ احسان ونیکی کا سلوک کرنا مستحسن ہے، لیکن ایسا اتحاد ان سے کسی وقت بھی نہیں ہو سکتا کہ مسلمان کی انفرادیت کھو کر وہ کسی وحدت اجتماعی کا جزو بن جائے۔ اور کسی متحدہ قومیت کیلئے ایسا اتحاد ضروری ہے، اس لئے کفار کے اشتراک سے متحدہ قومیت نہیں بنائی جا سکتی۔

کسی مشترک معاملہ میں اشتراک کے سلسلہ میں ایک "دفاعی قومیت" کی تعمیر کا سوال بھی آتا ہے، مثلاً ایک گاؤں میں مسلمان اور کافر دونوں رہتے ہوں، اور اس گاؤں پر ڈاکو حملہ آور ہوں تو یقیناً مسلمان کفار کے ساتھ مل کر لڑے گا، یہی صورت جب بڑے پیمانہ پر کسی ملک میں پیش آئے تو اس وقت جو اشتراک ہوتا ہے اس کا نام "دفاعی قومیت" رکھ لیا گیا ہے، اول تو اس کا نام قومیت رکھنا ہی غلطی ہے، قومیت کے معنی آپ سمجھ چکے ہیں، اس معنی میں اسے کسی طرح قومیت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک قسم کا اشتراک اور وقتی اشتراک ہے جو ڈاکوؤں کے فرار ہوتے ہی ختم ہو جائے گا، اگر مدت طویل یا دوامی ضرورت کے لئے مسلمان کفار کے ساتھ ایسا معاہدہ کریں تو یہ صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس معاہدہ میں بحیثیت ایک وحدت مستقل کے شریک ہوں،

اور معاملات دفاع میں کسی کافر جماعت کے احکام وارادہ کے پابند نہ ہوں ایسے معاہدے حکومتوں کے مابین ہوتے رہتے ہیں اس سے ان سب کی قومیتیں فنا ہو کر کوئی دفاعی قومیت پیدا نہیں ہوتی۔

کفار کی کثرت میں مسلمان کا فریضہ

ایک ایسے مقام پر جہاں مسلمان اپنی زندگی کفار کی کثرت کی وجہ سے اسلامی انداز میں بسر نہ کر سکتا ہو، وہاں اس کا فرض ہے کہ جلد از جلد اپنے لئے ایسے مرکز کی تعمیر شروع کر دے جہاں مسلمانوں کو ایک جگہ کر کے وہ کفار کے نرغہ سے نکل کر اسلامی زندگی بسر کرنے کی سہولت مہیا کر سکے، یہی کیا تھا، آقائے انام محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کو اس طرح گزارتے جس طرح گزارنے کا حکم اللہ تعالےٰ نے دیا تھا، پہلے آپ نے حبشہ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا، وہاں اگرچہ فرماں روا کی طرف سے کوئی سختی نہ تھی، مگر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ مسلمان حق خود انفصالی حاصل کر لیتے، بہرحال ایک ایسی قوم کے ساتھ رہنا تھا جو اسلامی اصول اجتماع سے اختلاف رکھتی تھی مسلمان کے لئے ایسی فضا سازگار نہیں ہو سکتی جہاں اسے خود تنفیذی اختیارات حاصل نہ ہوں اس کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی اور مسلمانوں نے وہ مرکز تعمیر کر لیا جس کی انھیں خاص اصول ونظام حیات کے ماتحت زندگی

بسر کرنے کے لئے ضرورت تھی ۔

ہندوستان میں آزاد مرکز

ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو یہی کرنا پڑیگا کہ جن صوبوں میں ان کی تعداد زیادہ ہے، انھیں مرکز کی حیثیت دینی پڑے گی، چاہے اس کے لئے کتنی ہی بڑی قربانی کرنی پڑے مگر اس کے بغیر زندگی صحیح اسلامی طور پر بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ ان صوبوں کے الگ ہوتے ہی صحیح اسلامی زندگی وہاں پیدا نہیں ہو جائے گی، مگر کم سے کم وہاں ان لوگوں کی تعداد تو زیادہ ہوگی جو اصول حیات میں اشتراک رکھتے ہوں گے اور یہ ممکن تو ہوگا کہ تعلیم و تلقین کے ذریعہ ان کو صحیح اسلامی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی جائے، اور ان کے دماغوں کی بچپن ہی سے تعلیم کے ذریعہ ایسی تربیت کی جائے کہ ان کے دماغوں میں نسل، وطن، اور جدید قسم کی قومیت کے شیاطین اڈہ نہ بنا سکیں، اس طرح ایک ایسی نسل پیدا ہو سکے گی جو اپنے اوپر خدائی قانون جاری کرنے کا نہ صرف حق رکھے گی بلکہ اس کے لئے متمنی بھی ہوگی۔

عبدالقدوس ہاشمی

اسلامی تہذیب

اور

آزاد سیاسی مرکز

اسلامی تہذیب کی نوعیت کیا ہے؟
اسکے لئے سیاسی استقلال اور آزاد مرکز کی
ضرورت کیوں ہے؟

(۱) اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے
(۲) اسلامی تہذیب کی بقا
(۳) اسلامی تمدن اور نظم عالم
(۴) ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین

مدنیّت اسلام

(علامہ اقبال علیہ الرحمتہ)

بتاؤں تجھکو، مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے، صفتِ آفتاب، اسکا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ، گوناگوں،
نہ اس میں عصرِ رواں کی، حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ دافسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوز دروں

(ضرب کلیم)

اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے

پنڈت نہرو اور اون کے بعض ہم خیال

تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب واطوار کا، وضع، لباس، کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگ تراشی اور مصوری کا، اور اظہارِ مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر تمدنی مظاہر میں گردشِ ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بارہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کے لئے

تیار ہو جاؤ، جن کا تقاضا، فضا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظِ دیگر جواہر لال نہرو اور انکی امت کے رجحانات کر رہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لئے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طریقِ فکر، اُس نظریۂ حیات، اور اس معیارِ امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتد بہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور جس کے زیرِ اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرزِ زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیرِ اثر اختیار کی جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلّی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرزِ خیال اور ان اصولِ حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرتِ رسولؐ سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر

ہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اسکی زبان، اسکے لٹریچر، اس کے آداب واطوار، اسکے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس وطرزِ معاشرت، اور اسکے فنونِ لطیفہ میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے خارج نہیں کر دیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لئے کوئی سندِ جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہو گا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لیکر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں سترِ عورت کے ان ہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دئے ہیں۔ لہذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس سمجھے جائینگے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہو گا تو ہم اُسے غیر اسلامی لباس کہینگے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کئے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں انکی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما

ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلّت سے متجاوز ہو گی تو ہم کہینگے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجئے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہر حال جب تک ان کے اندر اسلامی ذہنیت کی روح موجود ہو گی، اور جب تک یہ شریعتِ اسلامی کے ضابطہ میں رہینگے، ان پر یکساں "اسلامی تمدن" کا اطلاق ہو گا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کرینگے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کر لینگے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعتِ اسلام کے خلاف ہوں تو بلاشبہ یہ کہا جائیگا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور انکے یہ مسلمان تبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ

"اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے ان ہی کا

نام اسلامی تہذیب وتمدن رکھ دیا گیا ہے۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب وتمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اس گزرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اس بدلے ہوئے زمانے میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لئے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں"

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شائد یورپ کے سیاسی بازیگروں سے بھی بن نہ آتی۔ یہ ہمارے ہم وطن اس معاملہ میں اُن سے بھی بازی لے گئے۔

(ترجمان القرآن جلد ۱۳، عدد ۲، ۳، ۴، ۱۳۵۷ھ)

اسلامی تہذیب کی بقا

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقاء اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ایسا ہو جو اُنکے دل و دماغ میں اسلام کے طریقِ فکر و مقصدِ حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے، اور انکو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں، اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق

زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظامِ تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خودبخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں، اگرچہ انکے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو۔ اس غرض کیلئے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہئیت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اب جو انقلاب درپیش ہے اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کر سکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے۔ ہمیں اتنی طاقت حاصل ہو کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں، اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کر سکیں اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کریں۔ ہم کسی آزادیٔ وطن کو صحیح معنوں میں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ۱/۴ مسلمان آبادی کو یہ آزدی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو

وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں وطن کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو، اور نہ ہمیں کسی ایسی جنگ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جسکے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت اور استقلالِ وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے قومی نصب العین کو بھی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

(ترجمان القرآن جلد ۱۱ عدد ۵، ذی العقدہ ۱۳۵۶ھ م جنوری ۱۹۳۸ء)

اسلامی تمدن اور نظم عالم

ایک صالح نظام تمدن اور ایک پائیدار نظمِ عالم کی بنیاد رکھتے وقت ہمیں حسب ذیل بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا تاکہ ان خرابیوں کو اس میں داخل نہ ہونے دیا جائے جنھوں نے انسانی عافیت اور جماعتی امن و اتحاد کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔

۱۔ اولاً اس نظمِ عالم کو چند ابدی اور ناقابلِ تغیر اخلاقی اصول و قوانین پر مبنی ہونا چاہئے جنھیں قومی یا جماعتی خود غرضی یا انفرادی اغراض و مفاد کا تابع نہ بنایا جا سکے۔

۲۔ یہ اخلاقی اصول و قوانین انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حکمراں تسلیم کر لئے جائیں تاکہ انسان کی کوئی طاقت و صلاحیت خواہ عقلی ہو یا جسمانی ان قوانین کی گرفت سے باہر نہ جا سکے۔

۳- یہ نظام صرف خارجی زندگی کی اصلاح تک محدود نہ ہو بلکہ اس کے ذریعہ انسان کی نفسی زندگی اور اس کے باطنی محرکات میں بھی انقلاب پیدا کیا جائے تاکہ خارج کی اصلاح اور باطن کی درستگی پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

۴- اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اجتماعی اور انفرادی نصب العین پر رکھنی چاہیئے جس کو ہر انسان بلالحاظِ قوم، نسل، ملک اور وطن قبول کر سکے اس طرح ایک ایسی جماعت تیار کی جائے۔ جو جغرافی حدود اور نسلی و وطنی رشتوں سے بالاتر ہو۔ یہ جماعت ایسی ہو کہ پھیلتے پھیلتے پوری انسانیت کو سمیٹ سکے۔

۵- یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہو جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ کے لئے اصلاحی پروگرام رکھتا ہو اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو اصلاحی دستور العمل مرتب کیا جائے ان میں باہمی ربط اور مطابقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اسکا اندیشہ ہے کہ مختلف شعبہ جاتِ زندگی کے اصلاحی دستور العمل اپنی اپنی جگہ تو درست ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے بے ربط اور متصادم ہو جائیں۔

ان اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیجئے کہ دنیا نے جتنے مذاہب اور نظام پیدا کئے ہیں ان میں کونسا نظامِ زندگی یا کونسا مذہب

اِن شرائط کی تکمیل بدرجہ اتم کرتا ہے۔ مغربی تمدن نہ تو کسی اعلیٰ اخلاقی نظام کا پابند ہے اور نہ اس نے زندگی کے باطنی پہلو کی کوئی رعایت رکھی ہے۔ اسی کا نتیجہ وہ انتشار پیدا کرنے والی قوتیں ہیں جن کا ظہور آج شدت کیساتھ ہو رہا ہے۔ قومیت پرستی بحیثیت ایک نظام زندگی کے پیکار و تصادم کی طرف لے جاتی ہے یہ اخلاقی نظام کی گرفت سے بالکل آزاد ہے۔ اس کے علاوہ وہ انسانوں کے مابین ایک دائمی تفریق پیدا کرنے کی موجب ہے۔

اشتراکیت زندگی کے صرف ایک پہلو اور تمدن کے صرف ایک شعبہ کی اصلاح کے لئے ساعی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ زندگی کے اور تمام پہلو صرف معاشی زندگی کی اصلاح سے خود بخود درست ہو جائیں گے۔

فسطائیت اور نازیت قوم پرستی ہی کی ایک شدید تر شکل ہے اور اس میں قوم پرستی کے معائب و نقائص دوچند نظر آتے ہیں ایک بین الاقوامی وفاق کا تخیل اس وقت تک لایعنی رہے گا جب تک کہ اقوام عالم کے ضمیر میں کوئی بڑا انقلاب نہ پیدا ہو اور وہ محرکاتِ عمل نہ بدل جائیں جو گزشتہ دو تین صدیوں سے قوموں

اور جماعتوں کے طرزِ عمل کو متعین کرتے رہے ہیں۔

اب ان مذاہب کی طرف آیئے جو مشرق کی سرزمین سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ عیسائیت اور بدھ مذہب کا نقص یہ ہے کہ اصلاح باطن سے آگے نہیں جاتے ہیں حالانکہ باطنی اصلاح کیلئے ایک خارجی نظام اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ خارجی نظام کیلئے اصلاح باطن ضروری ہے۔ یہ دونوں مذاہب چند اخلاقی مواعظ و نصائح کا مجموعہ ہیں لیکن انہوں نے حکومت یا سیاست کا کوئی خارجی نظام نہیں تجویز کیا ہے جو ان مواعظ و نصائح کا انسان کو پابند بنا سکے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو صرف اخلاقی اصول پر قائم ہو اور جس میں کوئی خارجی قوت ایسی موجود نہ ہو جو ان اصول کی عملداری قائم کر سکے یا ان کی جماعت میں اپنی طاقت استعمال کر سکے بہت جلد مرکز گریز (CENTRI FUGAL.) قوتوں کا شکار ہو جائیگی۔ عیسائیت نے تو صاف کہدیا کہ "میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے"۔ یہی حال بدھ مذہب کا ہے کہ اس نے بھی فرد و جماعت یا فرد و حکومت کے تعلقات متعین نہیں کئے۔ پھر ان مذاہب نے زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے کوئی تفصیلی اصلاحی پروگرام بھی مرتب نہیں کیا بلکہ صرف چند اخلاقی اصول کو کافی خیال کر لیا۔ ان بنیادوں پر کوئی ہمہ گیر نظام عالم یا نظام تمدن نہیں

قائم ہو سکتا ہے۔ ہندو مذہب بیشک ایک ایسا مذہب ہے جو ایک خارجی معاشری نظام کا حامل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس نے اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس میں بھی ایک عالمگیر نظام تمدن کی بنیاد ڈالنے کی صلاحیت مفقود ہے کیونکہ وہ ایک نسلی، ملکی اور قومی مذہب ہے جس کا نقطۂ نظر جغرافی حدود میں مقید ہے اس کی بنیاد عدم مساوات پر رکھی گئی ہے اور انسانی مساوات کا تخیل اس کے دربار میں بار نہیں پا سکتا ہے۔ عیسائیت اور بدھ مت کی طرح وہ بھی روحانی ترقی اور تہذیبِ نفس کو ترکِ دنیا اور ریاضت وعبادات کے ساتھ مشروط قرار دیتا ہے۔

اسلام ہی دنیا کا وہ تنہا مذہب ہے جو ان تمام شرائط کی تکمیل کرتا ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کی تمام تعلیمات کی بنیادیں ایک اٹل اور دائمی نظام اخلاق پر استوار کی گئی ہیں جس میں مغرب کی سی افادیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ خیر و شر کا ایک ازلی و ابدی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماورا ہے حالاتِ زمانہ کی تبدیلیوں اور مصلحتِ وقت کے تقاضوں سے اُس کے بنیادی اصولِ اخلاق کو توڑا نہیں جا سکتا ہے ان بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اسلام کے جملہ

قوانین تمدن و معاشرتِ زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جو اس کے بنیادی اصول کے خلاف ہو یا شریعتِ اسلامی کے مقاصد اور اسلامی زندگی کے نصب العین کا ساتھ نہ دیتی ہو۔ بنیادی اصول اور مقاصد کا یہ ثبات اور استحکام اور ان کا اس طرح ناقابلِ تغیر ہونا ایک بہت بڑا تحفظ ہے ورنہ جس طرح مغربی ذہن نے اغراض و مفادات کے تحت ہر اخلاقی اصول کو توڑ ڈالا یہی حال اسلامی اصول و مقاصد کا ہوتا۔ اسلام کے بنیادی مقاصد اور شریعتِ اسلامی کے اخلاقی اصول میں انسانی خود غرضیوں اور کام جوئیوں کے اثرات راہ نہیں پا سکتے ہیں۔ پھر یہ ابدی اخلاقی نظام مغرب کی عقلیت پرستی (جو جذبات پرستی کا دوسرا نام ہے) کے خلاف سب سے بڑی حفاظت ہے۔ اسلام کا اخلاقی نظام عقل و فکر کی ترقی کا دشمن نہیں ہے لیکن وہ فکر و تعقل کی بے قید آزادی کا سب سے بڑا مخالف ہے وہ عقل کو معطل کرنا نہیں چاہتا ہے لیکن اس کو اخلاقی اصولوں کا تابع ضرور بنا تا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی میں عقل کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شریعت کے بنیادی مقاصد، اسلامی زندگی کے لئے دی ہوئی ہدایات اور جو اصول ان کے لئے وضع کر دئیے ہیں ان میں دخل اندازی کرے

ہاں اسے یہ آزادی ضرور عطا کی گئی ہے کہ وہ تفصیلی امور اور ذیلی قوانین پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ شریعت کے مقاصد سے تصادم تو نہیں ہوتے ہیں۔ عقل کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جب حوادث کے طوفان اور انقلاب کی آندھیاں زمانہ کا ورق الٹیں نت نئے حالات رونما ہوں، پرانا نظام معاشرت درہم برہم ہو جائے اور زندگی نئے نئے مطالبے پیش کرنا شروع کرے تو وہ کتاب وسنت کی روشنی میں مقاصدِ اسلام کو سامنے رکھتے ہوئے ان مطالبوں کو پورا کرے اور اسلامی نظامِ زندگی کے لئے نئے قوانین اپنی ذاتی بصیرت کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن وسنت کی بخشی ہوئی بصیرت کی بنا پر وضع کرے۔ اس طرح اسلام نے عقلی ارتقاء کی راہ تو متعین کر دی ہے لیکن عمل ارتقا میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی ہے۔ اس نے فکر کو ہرزہ گردی اور بے راہ روی سے بچا کر ایک متعین راستے پر ڈال دیا ہے۔

اس نے خارجی نظامات اور باطنی محرکات پر یکساں توجہ صرف کی ہے اور ایک دوسرے میں گہرا ربط اور تعلق پیدا کر دیا ہے اس طرح کہ ایک سے تغافل دوسرے کی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے۔ اسلام میں عبادت کا مفہوم صرف روزہ اور نماز ہی نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک ہر وہ عمل عبادت ہے جو اس کے وضع کردہ اصول کے مطابق ہو

خواہ وہ زندگی کے روزانہ معاملات سے متعلق ہو یا تمدنی اور معاشرتی امور سے تعلق رکھتا ہو۔

پھر اسلام ایک ایسا انفرادی اور اجتماعی نصب العین ہے جو قوم و وطن نسل و نسب اور جغرافی حدود سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ایک مضبوط رشتہ اتحاد ہے۔ یہ مختلف قوموں اور جماعتوں کو ایک سلسلۂ وحدت میں منسلک کر دیتا ہے۔ اس کا دروازہ ہر اُس شخص پر کھلا ہے جو اس کے انفرادی اور اجتماعی نصب العین کو دل سے تسلیم کرے خواہ اسکا تعلق کسی قوم، کسی ملک، نسل یا جماعت سے ہو۔ اس طرح وہ ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جو جغرافی حدود سے بالاتر ہے اور جس کی وسعت و پہنائی پوری انسانیت پر محیط ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی نصب العین کیا ہے؟ انفرادی زندگی میں وہ ایک خاص ضابطہ اخلاق، اصولِ عمل، اور فرائض و حقوق کا دستورالعمل ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور جس کا مقصد نیک عملی، راست کرداری اور معدلت شعاری کا قیام ہے۔ اس کا اجتماعی نصب العین حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ یہ ایک ایسی خارجی طاقت ہے جس کا فریضہ یہ ھیکہ وہ ان اصولِ اخلاق اور قوانینِ معاشرت و تمدن کی نگہبان ہو جو اسلام نے اپنے پیرؤں کے لئے وضع

کئے ہیں جو ان اصول و قوانین سے نافرمانی اور سرتابی کرنے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی کرے تاکہ احکام الہی اور نوامیس فطری کا احترام دلوں سے مٹنے نہ پائے۔ یہ اس قسم کا لادینی اسٹیٹ نہیں ہے جسے یورپ نے رواج دیا ہے اور جہاں فرد کے لئے ایک اصولِ عمل اور معیارِ اخلاق ہوتا ہے اور حکومت کے لئے دوسرا جہاں حکومت اور عامتہ الناس کی چیرہ دستیوں بدعملیوں اور ستم رانیوں پر کوئی اخلاقی گرفت نہیں ہوتی ہے۔

اسلام نے اپنے اسٹیٹ پر فرد کو نگہبان اور محافظ بنایا ہے تاکہ جب کبھی اسلامی حکومت اسلامی قوانین اور کتاب وسنت کے بنائے ہوئے اصولِ اخلاق کے خلاف جائے یا اس کی حفاظت اور نگہبانی میں تساہل برتے تو افراد اٹھ کھڑے ہوں اور اس کو تنبیہ کریں یا بدل ڈالیں اور افراد پر اسٹیٹ کو نگہبان مقرر کیا ہے تاکہ اگر کوئی فرد اس ضابطۂ اخلاق اور شریعت نامہ کے خلاف عمل کرے جو اسلام نے اپنے پیرؤں کے لئے بنائے ہیں تو حکومت اُسے سزا دے۔ یہاں افراد حکومت کے محافظ اور اس کے محتسب ہیں اور حکومت افراد کی نگہبان اور ان کی رہنما ہے۔

مذہب کا اثر اجتماع پر

اسلامی حکومت کے تحت مذہب اور عقائد پرائیوٹ چیزیں نہیں بلکہ وہ حکومت اور ریاست کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیزیں ہیں کیونکہ مذہب درحقیقت زندگی کا ایک فلسفہ اور کائنات کا ایک نظریہ ہے اور انسان کے تمام اعمال اس کے فلسفۂ زندگی اور نظریۂ کائنات کا عکس ہوتے ہیں خواہ ان اعمال کا تعلق خانگی زندگی سے ہو یا سیاست و معاشیات سے۔ نظریہ کائنات اور فلسفۂ حیات جیسے گہرے اصطلاحات سُن کر بعض لوگ کہینگے کہ عوام الناس کا ان فلسفیانہ رموز و اسرار سے کیا کام ہے۔ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے دنیا میں ہر شخص کا ایک فلسفۂ حیات اور نظریہ کائنات ہوتا ہے جس کو وہ عقلی استدلال یا منطقی ردو قدح کے ذریعہ سے نہیں بلکہ سوسائٹی کی تربیت ماحول کے موثرات اور خارجی زندگی کے تجربات سے حاصل کرتا ہے۔ یہ بات کہ ایک شخص معاشرتی زندگی، معاشی کاروبار یا سیاسی امور میں کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کریگا محض یہ دیکھکر معلوم کی جاسکتی ہے کہ زندگی کے متعلق اسکا نقطۂ نظر کیا ہے۔ آیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ زندگی محض ایک عارضی تماشہ ہے جس کے بعد عدمِ محض ہے یا وہ زندگی کو ایک آزمائشی منزل خیال

کرتا ہے جس سے گذر کر وہ ایک وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا۔ آیا وہ جزا و سزا کی حقیقت کا قائل یا اس کو ایک وہم باطل سمجھتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ رکھنا چاہیئے انسانی فطرت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ زندگی ایک وحدت ہے۔ جس اصولِ عمل اور ضابطۂ اخلاق کا انسان زندگی کے کسی ایک شعبہ میں پابند ہوتا ہے، وہی دوسرے شعبوں میں اسکے اعمال کو متعین کرتے ہیں۔ یورپ اپنی ساری عقلی ترقی کے باوجود ان حقائق کو نہ سمجھ سکا یا اگر سمجھا تو ان سے اغماض کیا۔ اس نے مذہبی عقائد کو ایک خانگی چیز قرار دیا حالانکہ ہمارے عقائد ہماری معاشرتی، خانگی اور تمدنی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ کیا کوئی شخص اس بات کے ماننے کو تیار ہوگا کہ جو شخص اپنی خانگی زندگی میں بدچلن، بدمعاملہ، فریبی اور ناقابلِ اعتماد ہو وہ پبلک لائف میں ایماندار، راست کردار اور قابلِ اعتماد ہوگا۔ انسانی شخصیت ایک مجموعی وحدت ہے اور یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ خانگی زندگی کے لیئے معیارِ اخلاق ہو اور بیرونی زندگی میں دوسرے معیارِ اخلاق پر عمل کیا جائے۔ اسلام زندگی کی اس وحدت کو فراموش نہیں کرتا ہے اور اس لیے جو ضابطۂ اخلاق اور اصولِ عمل فرد کیلئے بنائے ہیں وہی اصول و قوانین حکومت اور اربابِ حکومت کیلئے بھی وضع کئے ہیں۔

آخر میں میرا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک اصولِ عمل، ضابطۂ اخلاق، عقائد کا ایک مجموعہ، تمدن کا ایک نظام، حکومت کا ایک تصور اور معاشرت کا ایک نظریہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ فکر کا صحیح ترین اصول اور عقلی ارتقاء کا سب سے سیدھا راستہ بھی ہے۔ اس لئے فکر کی سلامت روی اور عقل کی راستی جو کچھ، جہاں کہیں، اور جتنی کچھ ہے وہ سب اسی میں اور اسی سے ہے۔ دنیا کے اور تمام نظامات، فلسفۂ زندگی کے اور تمام نظریئے، اور فکر و تعقل کی اور تمام راہیں منزلِ مقصود سے بھٹکانے والی اور اجتماعی زندگی کیلئے ہلاکت خیز ہیں۔

صحت اور راستی، صداقت اور سچائی جزوی طور سے اور منفرد حالت میں اور بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں مگر ان کی پوری وحدت ان کا کامل اجتماع اور ان کا باربط انضباط صرف اسی مذہب میں پایا جاتا ہے۔

مستقبل کے لئے جتنے نظامات تجویز کئے جا رہے ہیں اور تجویز کئے جا سکتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی بنیادی نقص ضرور ایسا ملے گا جو انکی ساری خوبیوں اور نفع بخشیوں کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ دنیا اگر ایک پائدار اور مستحکم نظام کی متلاشی ہے اور قیام امن کیلئے بے قرار ہے، اگر مالی خوش حالی اور اخلاقی

ترقی بیک وقت اس کا مطمح نظر ہیں تو پھر اس کے لئے اور کوئی راہ یا نظامِ کام آنے والا نہیں ہے بجز اس نظام کے جسے اسلام نے تجویز کیا ہے اور اُس راہ کے جس کی طرف پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے رہنمائی کی ہے

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

اور اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے

(جامعہ جلد ۳ نمبر (۷)، اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین

یہ تو ہمارا اصلی مقصد ہماری زندگی کی غرض وغایت اور ہماری اجتماعی کوششوں کا محور ہوا لیکن اب سوال یہ ہے کہ سیاسیات میں ہمارا مقصد کیا ہونا چاہئے اور حصولِ مقصد کیلئے بحیثیت ایک مستقل جماعت کے مسلمانوں کے کیا مطالبات ہونے چاہئیں؟ آبادی کے تناسب سے ہماری نشستیں اسمبلیوں اور میونسپلیٹوں میں برقرار رہیں اور ہماری زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے یہ ہماری اجتماعی بقا کیلئے بالکل ناکافی ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کامل تہذیبی خود مختاری (Culture autonomy) حاصل ہو جائے اور دوسرے یہ کہ ہم اپنا علیحدہ ملی وطن قائم کریں، جہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح

چاہیں حکومت کریں۔

(رسالہ جامعہ جلد ۳۱ نمبر ۱ جنوری ۱۹۳۹ء)

اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کا یہ نصب العین رکھنا کہ بس ہمیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملک کے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ مل جائے یا جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں مسلماں وزارتیں قائم ہو جائیں دراصل ایک بڑی غلطی ہے جس سے کوئی بھی صحیح الخیال مسلمان متفق نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہمارے مقاصد میں یہ بھی تو شامل ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط اور ہماری تمدنی آزادی برقرار رہے لیکن عرض یہ ہے کہ تمدنی آزادی کا جو تخیل ہمارے مدبرین اور سیاست دان حضرات کے نظروں کے سامنے ہے ہم کو اس سے اختلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تمدن نام ہے طرز زندگی، طریق معاشرت، زبان اور آداب و رسوم کا حالانکہ یہ سب تمدن کے مظاہر ہیں نہ کہ اسکی حقیقی روح۔ اسلامی تمدن تو دراصل ایک خاص ذہنیت اور زندگی کے ایک خاص زاویہ نگاہ کا نام ہے یہ ممکن ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط محفوظ رہے، ہمارے رسم و رواج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو، ہماری مسجدیں اور خانقاہیں آراستہ اور پیراستہ رہیں لیکن ان مختلف تمدنی مظاہر کے پیچھے جو روح کارفرما ہے جن نظریات و افکار نے اس مخصوص تمدن کی تشکیل کی ہے جس طریقِ فکر

اور نظریۂ حیات پر اس تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے وہی بدل جائے۔ اس کو مٹا دیا جائے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بدلنے کے بعد ہماری تہذیب و معاشرت ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط ہر چیز خود بخود بغیر کسی خارجی کوشش کے بدل جائے گی۔ کیونکہ جب وہ ذہن باقی نہ رہا جس نے تمدن کی اس عمارت کو بنایا تھا تو ضرور ہے کہ عمارت کا نقش بھی بدل جائے گا۔ پھر اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے کہ یہ تمدنی روح، یہ نظریات و افکار، یہ طریقِ فکر اور مخصوص ذہنیت محسوسات میں سے نہیں ہیں جن کا بدلنا اور مٹنا ہی ہماری آنکھیں دیکھ سکینگی۔ یہ چیزیں تو بتدریج غیر محسوس طریقہ سے بدلتی ہیں اور جب ان میں کامل تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تب جا کر کہیں ان کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک نصب العین ہونا چاہیئے اور یہ وہ کہ ہمارا مستقل قومی وجود جن معنوی خصوصیات سے عبارت ہے وہ نہ صرف باقی رہیں بلکہ انہیں نشو و ارتقا کی راہ پر لگایا جائے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے ذہن اسلامی ذہن ہوں، ہمارے افکار و نظریات کی بنیاد مذہبی ہو اور ہماری قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے۔

اس غرض کی تکمیل کیلئے سیاسی استقلال اور آزاد مرکز "پاکستان" ناگزیر ہے۔

ہندوستان کا غیر سیاسی مرض اور اسکا علاج

قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کا وہ مضمون جو

"ٹائم اینڈ ٹائیڈ" لندن مورخہ ۱۹ار جنوری ۱۹۴۰ء میں شایع ہوا

آج کل ہندوستان جن دستوری امراض میں بتلا ہے انھیں ایک ایسی بیماری کے اعراض سے تعبیر کرنا بہتر ہوگا جو ملک کے نظام سیاست میں جڑ پکڑ چکی ہے مگر جب تک مرض کی تشخیص نہ ہوسے کسی عرض کا سمجھنا ممکن ہی اور نہ دوا کا تجویز ہونا۔ اس لئے آئیے پہلے مرض کی تشخیص کریں۔ اس کے بعد اعراض پر غور کرینگے اور آخر میں علاج کی طرف توجہ کی جائے گی۔

سوال یہ ہی کہ ہندوستان کا سیاسی مستقبل کیا ہی؟

حکومت برطانیہ کا معلنہ نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کم سے کم ممکن العمل مدت میں قانون وسٹ منسٹر کے مطابق درجہ مستعمرات حاصل کرلے۔ اس مقصد کے لئے برطانوی حکومت جس عمومی نظام کو سب سے بہتر خیال کرتی ہے طبعاً

اسی کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتی ہے۔ یہ نظام وہی ہے جسکے زیر اثر ملک کی حکومت اس سیاسی جماعت کے تفویض کردی جاتی ہے جو میدان انتخاب میں سب سے زیادہ کامیاب ہو۔

ہندوستانی مسائل کے متعلق خود برطانوی پارلیمان کے اراکین میں ایسی لاعلمی پھیلی ہوئی ہے کہ ماضی کے تمام تجربات کے باوجود ابتک اس کا احساس نہین ہوا کہ حکومت کی یہ شکل ہندوستان کے لئے قطعاً ناموزون ہے۔ جس عمومیت کی بنیاد انگلستان جیسی متجانس (Homogeneous) قوم کے تصور پر مبنی ہو وہ ہندوستان جیسے متخالف العناصر (Hetrogeneous) ممالک کیلئے کسی طرح موزون نہین ہوسکتی۔ یہی ایک سادہ حقیقت، ہندوستان کے تمام دستوری امراض کا بنیادی سبب ہے۔

حد یہ ہے کہ لفٹنٹ کرنل میور ہیڈ آنجہانی نائب وزیر ہند بھی اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور انھون نے موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی پر متاسفانہ انداز میں یہ رائے ظاہر کی کہ جو لوگ برسر اقتدار ہیں اور جو اُن کی مخالفت کر رہے ہیں دونوں یہہ سمجھ رہے ہیں کہ جو موقف اب ہے وہی ہمیشہ باقی رہے گا۔ انھون نے اس واقعہ پر افسوس کیا کہ ہندوستانی عمومی حکومت کی ایک اساسی خصوصیت

سمجھنے میں ناکام رہے وہ اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اکثریت اور اقلیت کوئی پائیدار چیز نہیں اس لئے نائب وزیر ہند کے نزدیک اقلیتوں کا وفاق کی مخالفت اس مفروضہ پر کرنا کہ اقتدار شروع ہی سے ایک اٹل اکثریت کے ہاتھوں میں رہے گا، کوئی مضبوط اساس نہیں رکھتا۔ لیکن کرنل موصوف اس بات کو بھول گئے کہ عمومیت کی شرط اولین واحد قومیت کا تصور ہے خواہ قوم معاشی حیثیت سے کتنی ہی زیادہ منقسم کیوں نہو۔ اگر وہ ہندوستان کی دستوری اصلاحات کا مطالعہ جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے شروع کرتے تو شائد ہندوستانی مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے۔ (میقات ہائے ۳۳و۳۴ء۱۹ جلد اول فقرہ ۱)

"ہندوستان بہت سی قوموں کا مسکن ہے........ یہ قومیں اپنی اصل، روایات اور وضع زندگی میں ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی یوروپ کی قومیں۔ ہندوستان کے دو تہائی باشندے کسی نہ کسی شکل میں ہندومت کو اپنا مذہب بیان کرتے ہیں۔ ۷ کروڑ ۷ لاکھ سے زیادہ نفوس اسلام کے پیرو ہیں اور ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ زیادہ صحیح معنوں میں صرف مذہب ہی کا نہیں بلکہ قانون حیات اور ثقافت کا بھی ہے۔ ان دونوں کو دو متمائز اور

جداگانہ تہذیبوں کی حامل قومیں کہا جاسکتا ہے۔ ہندومت اپنی ذات پات کے فلسفہ سے پہچانا جاتا ہے جو اسکے مذہبی ومعاشری نظام کا اساس ہے اور ایک نہایت مختصر دائرہ کے سوا مغرب کے فلسفوں سے غیر متاثر رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام انسانی مساوات کے تصور پر مبنی ہے"۔

غالباً اس بیان سے زیادہ صاف اور سچا بیان ہندوستاں کے متعلق ایک فقرہ (پیراگراف) کے اندر نہ آیا ہوگا اس پس منظر کے بغیر ہندوستانی مسائل کو سمجھنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اہل برطانیہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہندومت اور اسلام دو "متمایز" اور بالکل جداگانہ تہذیبین ہیں۔ جو ایک دوسرے سے اپنی اصل، روایات اور طرز زندگی میں اتنی ہی مختلف ہیں جتنی یوروپ کی قومیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں اور جبکہ یہ حقیقت جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی جیسی اہم اور مستند جماعت نے بھی تسلیم کرلی ہے تو پھر مسلمان قوم کے پاس برطانوی حکومت کی اس دانشمندی پر اعتراض کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اُس نے ہندوستان پر مغربی طرز کی عمومیت کا نظام کیوں مسلط کردیا اور اس طرح مسلط کیا کہ اس نظام میں وہ شرائط اور تعینات بھی

واخل نہ کئے جو اسے ہندوستانی حالات سے مطابق بنانیکے لئے ضروری تھے۔

جب یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک بڑی اور ایک چھوٹی قوم آباد ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ پارلیمانی نظام جو اکثریت کے اصول پر مبنی ہو ناگزیر طور پر بڑی قوم کی حکومت ہوگا۔ تجربہ ثابت کرچکا ہے کہ کسی سیاسی جماعت کا پروگرام کیسا ہی سیاسی یا معاشی ہو، ہندو ایک عام اصول کے طور پر اپنی ذات والوں کو اور مسلمان اپنے ہم مذہبوں کو ووٹ دیتے ہیں۔

برطانوی لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے بعض اوقات خود اپنی تاریخ کی مذہبی جنگیں فراموش کر جاتے ہیں اور آج مذہب کو آدمی اور خدا کے درمیان ایک انفرادی و شخصی معاملہ خیال کرتے ہیں۔ ہندو مت اور اسلام میں یہ صورت ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ دونوں مذہب آدمی اور خدا کے درمیان تعلق سے زیادہ آدمی اور اسکے ہمسایہ کے درمیانی تعلقات پر اثر انداز ہیں۔ وہ صرف اسکے قانون اور ثقافت ہی پر نہیں بلکہ اس کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی رہتے ہیں۔ ان مذاہب نے جو بالکل مخصوص نوعیت کے ہیں، اپنے دائرہ سے غیر اشخاص کے منضم ہو جانے اور خیال کے یکساں ہونے کا امکان ہی خارج

کر دیا ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جن پر مغربی عمومیت مبنی ہے۔ یہ مذاہب ایسی نظری تقسیم نہیں کرتے جنھیں عمومیت ختم کر دے بلکہ یہ حقیقی اور قطعی طور پر قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتے ہیں۔

مغربی عمومیت ہندوستان کے لئے بالکل ناموزون ہے اور ہندوستان پر اسے عائد کرنا نظام سیاست میں ایک مرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب ہمیں اسکے ناگزیر اعراض پر غور کرنا ہے۔

ایک اعلیٰ درجہ کے شاطر ہندو سیاستدان یعنی مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں کانگریس (جو سراپا ہندو ادارہ ہے) پہلے ہی جان چکی تھی کہ ہندوستان بھر میں مستقل غلبہ کا مقصد صرف مغربی وضع کی عمومیت ہی کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ان کی تمام کوشش، اور قوتیں ہندوستان کے لئے ایک کامل عمومی طرز کی حکومت حاصل کرنے پر مرکوز ہو گئی تھیں، انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نیا دستور اگر ان کے رہنما اور مجلس عاملہ کے وضع کردہ خطوط پر چلایا جا سکا تو منزل مقصود کو قریب تر بنا دے گا۔

یہی وجہ تھی کہ ادھر تو کانگریس یہ شور مچاتی رہی کہ نیا دستور سراپا ناقابل اطمینان اور بالکل ناقابل قبول ہے۔ ادھر اُسنے نفاذ دستور سے

پہلے ہی انتخاب میں مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جیسا کہ لازماً ہونا چاہیئے تھا ہندوستان کے چھ ہندو صوبوں میں جنکے نام بمبئی، مدراس، یو پی، بہار اور اڈیسہ ہیں کامل اکثریتیں حاصل کریں مگر ساتھ ہی اسے پانچ مسلم صوبوں میں، بنگال، پنجاب، سندھ، شمال مغربی صوبۂ سرحد اور آسام میں پوری شکست ہوئی مزید برآں وہ ہندو صوبوں میں بھی غیر ہندو حلقہ ہائے انتخاب خصوصاً مسلم حلقوں میں نشستوں کی کوئی قابل لحاظ تعداد حاصل نہ کر سکی۔

بلاشبہ یہ صورت حال ایک من مانی "قومی" جماعت کے لئے سخت تشویش کا باعث تھی کیونکہ اس طرح اسکی فرقہ وارانہ نوعیت کا پول کھل جاتا اس لئے فوراً کانگریس کی مجلس عاملہ نے واردھا کا رُخ کیا اور وہاں سر جوڑ کر حالات پر گہری نظر ڈالی۔ اس وقت واقعات کی صورت یہ تھی کہ پانچ صوبوں میں کانگریسیوں کو شکست ہو چکی تھی چھ صوبوں میں انھیں کامل اکثریت حاصل تھی۔ مخالفین کانگریس گو شمار میں کم تھے تاہم انھیں ارکان مسلم لیگ کی چھوٹی مگر ٹھوس جماعت کی رہنمائی حاصل تھی۔

اس صورت حال کے دو پہلو کانگریس کے لئے نہایت غیر طمانیت بخش تھے۔ ایک تو اسکی بدولت کانگریس کی ہندوانہ ہیئت ترکیبی آشکارا

ہوگئی تھی دوسرے جب تک صوبوں کے گورنروں کو اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے مخصوص اختیارات حاصل تھے اس وقت تک ان مخالف جماعتوں کو جو مسلمانوں کی رہنمائی میں تھیں نظرانداز کرنا یا دبا دینا مشکل تھا۔

یہ معلوم ہوتے ہی کہ اس نوع کے حالات بڑی حد تک اسکی تدابیر میں رکاوٹ پیدا کر دینگے کانگریس نے فوراً اپنا ترپ کا پتہ کھیلا۔ اسنے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وائسرائے اور گورنروں نے بلاپس وپیش کانگریس کے آگے سر جھکا دیا جس سے مسلمان اور دوسری اقلیتیں سراسیمہ ہوگئیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کانگریس ان کے ساتھ کیا سلوک کریگی۔ کانگریس کو کن تیقنات کی ضرورت تھی۔ اس کا جواب صاف ہے۔ "ہمیں اسکا اطمینان دلادو کہ تم خاص اختیارات استعمال نہ کروگے تو ہم عہدے قبول کرینگے" اسپر اقلیت اور دوسرے حقوق کے آئینی محافظوں نے اعتماد کا بوجھ سر سے اتار پھینکا اور کانگریس اور گورنمنٹ دونوں نے ایک دوسرے کی سیاست دانی وتدبر نوازی کا قصیدہ پڑھکر باہم سیاسی اتحاد کرلیا۔

مگر اسکو کیا کرتے کہ ابتک وہ تکلیف دہ موضوع بحث موجود تھا۔ سارا کھیل بگڑ جاتا اگر خالص ہندو حکومت برسر عہدہ ہوتی۔ کم از کم تین یا چھ

صوبوں میں ایک مسلمان بھی کانگریس کے ٹکٹ پر نہ آیا تھا اور دوسرے صوبوں میں ایک یا دو سے زیادہ مسلمان نہ تھے مگر انہیں اس کی کیا پروا تھی۔ یقیناً مسلمان اراکین میں کم سے کم ایک رکن ضرور ایسا تھا جو وزارت کے لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا اور آسانی سے ان کے داؤں میں آجاتا۔ اگر وہ کانگریس کے میثاق پر دستخط کرتا تو یہ اسے وزارت پیش کرتے۔

لیکن کیا گورنر اس چال کو پسند کر لیتے؟ ان کی دستاویز ہدایات اس بارہ میں کیا مشورہ دیتی تھی؟ "ہمارے گورنر اپنے وزرا کو انتخاب کرنے میں طریقہ ذیل کے مطابق پوری کوشش کرینگے، یعنی اس شخص کے مشورہ سے جو ان کی رائے میں مقننہ کی مستحکم اکثریت کا لیڈر ہو ایسے اشخاص کا تقرر کریں گے جو اجتماعی طور پر مقننہ کا اعتماد حاصل کر سکیں لیکن اس عمل میں انھیں اپنے وزرا کے درمیان ایک مشترکہ ذمہ داری کو ترقی دینے کی ضرورت ملحوظ رکھنا ہوگی۔"

مجلس عاملہ نے بے تابی کے ساتھ ان مضمرات کا تجزیہ کیا۔ ہدایات دو حصوں میں منقسم معلوم ہوتی تھیں "پہلے حصے میں گورنروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ایسے اشخاص کو وزیر منتخب کرنے میں پوری کوشش صرف کریں .... (جہانتک ممکن ہو اہم اقلیتی

اقوام کے ممبروں کو شامل کریں) جو مفہوم ان الفاظ کی تہ میں پنہاں ہے بالکل صاف تھا۔ اہم اقلیتوں کے لئے ایک وزیر مقرر کرنا تھا۔ جسے ان کا اعتماد حاصل ہو اور چونکہ مقننہ میں کانگریس اور مسلم لیگ پارٹیوں کے سیاسی پروگراموں میں کوئی اختلاف نہ تھا اس لئے ایک رکن مسلم لیگ کے بحیثیت وزیر منتخب نہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

لیکن اس آخری سطر کے متعلق کیا عمل ہوتا "لیکن ایسا کرنے میں انھیں اپنے وزرا کے درمیان ایک مشترکہ ذمہ داری کو ترقی دینے کی ضرورت ملحوظ رکھنا ہوگی" اگر گورنر اس دوسرے حصے کو جو اصل ہدایت کے مقابلہ میں مشاورتی وضمنی نوعیت کا ہے پہلے حصے پر حاوی کرنا روا رکھتے تو خوش قسمتی سے اس سطر کو کانگریسیوں کے مقاصد کی تکمیل کے لئے پھیرا جا سکتا تھا۔

اس مقصد کے لئے کانگریسیوں کے لئے صرف اسی قدر دعوی کرنا کافی تھا کہ جب تک مسلمان وزیر کانگریس کی مجلس عاملہ کے فیصلوں کی تعمیل کے لئے تیار نہ ہو مشترکہ ذمہ داری کا حصول ناممکن ہوگا۔ دراصل انھوں نے یہ ایک نکتہ پیدا کیا تھا جس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ گورنروں نے دبکر سر جھکا دیا اور اس غرض سے کہ

کانگریس اپنے آپ کو "نیشنل" (قومی جماعت) ظاہر کر کے پبلک کو دھوکا دے سکے اقلیتوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے وزرا کی کونسل میں اقلیتوں کا نمائندہ شامل کرلیا گیا مسلم وزرا کی حیثیت سے ایسے افراد کو قبول کرلیا گیا جو کسی معنی میں بھی مسلمان قوم کے نمائندہ نہ سمجھے جا سکتے تھے اور میثاق کانگریس پر دستخط کرنیکی وجہ سے صرف مجلس عاملہ کے سامنے جوابدہ تھے۔

کانگریس ان آسانی سے حاصل کی ہوئی فتوحات پر حیرت زدہ ہوکر قوت کے نشہ میں سرشار ہوگئی۔ اس کی مجلس عاملہ نے ایک متوازی مرکزی حکومت کی ناجائز حیثیت حاصل کرلی جس کے سامنے صوبہ واری حکومتیں جوابدہ تھیں۔ اس سلسلہ میں حلقہ وار ڈکٹیٹر انتخاب کئے گئے وزرا ان کے احکام کے کلیتہً پابند تھے اور کوئی صوبہ واری قانون ان کی رضامندی کے بغیر نہ بن سکتا تھا۔ اب انھوں نے جو تھوڑی سی مخالفت موجود تھی اسے بھی نظر انداز کرنا شروع کردیا اور برٹش گورنمنٹ سے نمٹنے کے بعد مسلمانوں سے سمجھنے لگے۔

اس موقع پر ہندوستان بھر میں مسلمانوں پر حملہ کی مہم جاری ہوگی۔ پانچوں مسلمان صوبوں میں اس کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا کہ جو متحدہ وزارتیں مسلمانوں کی رہنمائی میں قائم ہیں انھیں

شکست دی جائے۔ مقامی سیاسی ترغیبات کے ذریعہ سے کانگریسی وزارتیں دو صوبوں میں اور قائم ہوگئیں یعنی شمال مغربی صوبۂ سرحد اور آسام میں۔

چھ ہندو صوبوں میں ایک (Kature Kampf) (نازیوں کی سی تہذیبی جدوجہد) شروع کی گئی۔ کوششیں کی گئیں کہ بندے ماترم کانگریس کا فرقہ وار ترانہ قومی ترانے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے، کانگریس جھنڈا قومی جھنڈا قرار پائے اور حقیقی قومی زبان اردو کی جگہ پر ہندی کو مل جائے۔ ہر جگہ جبر و تعدی شروع ہو گیا اور مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں شکایتوں کا ایسا تانتا بندھا کہ ان کی تحقیقات کے لئے پیرپور کمیٹی مقرر کی گئی، جس کی رپورٹ مل سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایسی بے پناہ شہادت فراہم ہوئی کہ مسلمانوں نے وائسرائے اور گورنروں سے جو ہمیشہ ان کی حفاظت کے لئے نکتہ چینی کیا کرتے تھے مایوس ہو کر مجبوراً تھوڑے ہی دن ہوئے شکایات کی تحقیقات کے لئے شاہی کمیشن کے تقرر کی درخواست کی۔

کانگریسی وزارتوں کے سبکدوش ہونے کے قریب حالات کا رنگ وہ تھا جو ابھی بیان کیا گیا۔ یہ وہ موقف تھا جسپر برطانوی لوگ اچھی طرح غور کر سکتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کی خواہش ہے کہ

ہندوستان ایک باقتدار جماعتی ہندو مملکت بن جائے اس حالت میں کہ مرکز اور تمام صوبہ داری حکومتیں ان کی مجالس مقننہ یا انتخاب کرنے والوں کے آگے نہیں بلکہ مجلس عاملہ کانگریس یعنی ایک سیاسی جتھے کے سامنے جس کا دستور میں کوئی ذکر نہیں۔ جوابدہی کریں۔ انھیں خوب معلوم رہنا چاہئے کہ اگر ایک مجلس دستور ساز Constitment assembly) کے توسط سے کانگریس کا حق دستور سازی ہند تسلیم کر لیا گیا تو اسکا ناگزیر نتیجہ یہی ہوگا۔

اب ہمیں مختصر طور سے اس مبہم اور ناقابل عمل مجلس دستور ساز Constitmentassembly کے مضمرات پر غور کرنا ہے۔

پہلے اسی کو دیکھ لیا جائے کہ یہ مطالبہ اس خاص موقع پر کس لئے کیا گیا؟ جواب واضح ہے۔ جنگ مجلس عاملہ کے لئے گویا ایک خدا داد وسیلہ ہے جس کے سہارے وہ اپنی حکومت آٹھ صوبوں سے بڑھکر تمام ہندوستان میں پھیلا دینا چاہتی ہے۔ اگر برطانوی حکومت ادسان کھو بیٹھے اور جنگ سے رونما ہونے والی نازک حالت کے دباو سے جال میں پھنس جائے تو ہندوستان کو ایک ایسے خطرناک وقت کا مقابلہ کرنا پڑے گا جس کے نتیجہ کی پیشین گوئی کوئی نہین کر سکتا اور مجھے پورا یقین ہے کہ مسلم ہندوستان

اس موقف کے آگے ہرگز سر نہ جھکائے گا اور اپنے مقدور بھر ہر ذریعہ سے اس کے مقابلہ پر مجبور ہوگا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر یہ مجلس دستور ساز کس قسم کے دستور سازوں پر مشتمل ہوگی؟ ہندوستان میں ایک سرسری حساب سے ۳۰ کروڑ اشخاص ایسے ہیں جو یاس انگیز حد تک جاہل ہیں اور اس میں خود ان کا کوئی قصور نہیں یہ لوگ مذہبی پیشواؤں اور ذات پات کی بندھنوں کے پامال کئے ہوئے ہیں۔ اس بات کا کوئی حقیقی تصور نہیں رکھتے کہ وہ آج تک کیوں محکوم چلے آرہے ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ایسے لوگوں کے منتخب کردہ نمایندوں کے تفویض کردیا جائے۔ کیا ایسی صورت میں یہ کہنا بیجا نہیں کہ منتخبہ نمایندوں کی زبردست اکثریت چونکہ جاہل ہندوؤں پر مشتمل ہوگی اس لئے مجلس دستور ساز مذہبی نہا تماگا اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کے زیر اثر ہوگی۔ اور جو دستور تیار ہوگا وہ مجلس عاملہ کی ہدایات کے مطابق ہوگا۔

غرض، کانگریس کی مجلس عاملہ کانسٹی ٹوئینٹ اسمبلی کی وساطت سے اس طرح اپنا مقصد حاصل کرے گی۔ برطانوی اقتدار اور تجارت غائب ہوجائے گی۔ اور ہندوستانی ریاستین تباہ

کر دی جائیں گی۔ اقلیتوں کی مخالفت پامال کر دی جائیگی اور ایک بڑی ہندو قوم وجود میں آئے گی جو اپنے محبوب لیڈر مہاتما گاندھی اور مجلس عاملہ کے زیر حکومت ہو گی۔

ہم بیماری اور اسکی علامات پر غور کر چکے۔ اب اس کا علاج سوچنا ہے جسکی شکلیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اہل برطانیہ کو آگاہ ہونا چاہئیے کہ غیر مشروط مغربی عمومیت ہندوستان کے لئے بالکل ناموزوں ہے۔ یہاں اسکے عائد کرنے کی کوشش ختم کر دی جائے۔

۲۔ یہ مان لینا چاہئیے کہ ہندوستان میں "جماعتی" حکومت مناسب نہیں ہے اور تمام حکومتیں مرکزی ہوں یا صوبہ داری ایسی ہوں جو رعایا کے تمام فرقوں کی نمائندگی کریں۔

اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ نے حسب ذیل عام اصول وضع کئے ہیں۔

۱۔ برطانوی حکومت کو ہندوستان کے آیندہ دستور کے تمام مسئلے پر از سر نو نظر ثانی کرنی چاہئیے۔ اور جو تجربہ حالیہ صوبہ واری دستور کے کام اور اس انتظام سے حاصل ہوا ہے اس سے استفادہ کرنا چاہئیے۔

۲۔ چونکہ مسلم لیگ ایک آزاد ہندوستان کے لئے کھڑی ہوئی ہے اس لئے کسی ایسے وفاقی مقصد سے اسکی مخالفت اٹل رہے گی

جسکا نتیجہ اکثریتی قوم کی حکومت ہو اور جو عمومیت اور حکومت کے پارلیمانی نظام کی آڑ میں چلائی جائے۔

۳۔ ہندوستان سے متعلق دستوری پیش رفت کا کوئی اعلان آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری و رضامندی کے بغیر نہ ہونا چاہئے نہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کو اس شرط کی تکمیل کے بغیر کوئی دستور وضع یا آخری طور پر نافذ کرنا چاہئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایک ایسا دستور بننا چاہئے جو یہ تسلیم کرے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں اور ان دونوں کو اپنے وطن ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق ملنا چاہئے۔

مسلمان ایسے دستور کی تیاری میں برطانوی حکومت، کانگریس یا کسی جماعت سے بھی تعاون کرنے پر آمادہ ہیں تاکہ موجودہ عداوتوں کا سدباب ہو جائے اور ہندوستان دنیا کے بڑے ملکوں کے درمیان اپنا مقام حاصل کر سکے۔

تقسیم کا مطالبہ

یوم پاکستان (۱۹ر اپریل سنہ ۴۰ء) کے موقع پر
سیلم مین پرائمر - ای - وی راماسوامی لیڈر جسٹس
پارٹی کی تقریر، مطبوعہ سنڈے آبزرور ۲۸ر اپریل سنہ ۴۰ء

آج ہم لوگ اتنی بڑی تعداد میں تقسیم کا مطالبہ پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہمارے سیاسی مخالفین نے جلسہ میں برہمی پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ ایک بدترین طریقہ عمل تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے پاس غالباً کوئی معقول پروگرام یا پالیسی نہیں ہے۔

تقسیم کا مطالبہ غلط نہیں

کیا ہندوستان کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے کا مطالبہ غلط ہے؟ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں شدید قسم کے اصولی اختلاف موجود ہیں۔

کیا ایسی صورت میں سارے ہندوستان کا ایک وحدت قرار دیا جانا تقسیم کی بہ نسبت زیادہ تکلیف دہ اور مصیبت انگیز نہ ہوگا؟

جو لوگ تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں، انھیں کسی معنی میں غلط کار و مجرم نہیں کیا جا سکتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب کسی گھرانے میں شدید قسم کا اختلاف موجود ہو تو کسی رکن خاندان کا مطالبۂ تقسیم خاندانی بہبودی کے خلاف عمل ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کو سیاسی طور پر کئی حصوں میں منقسم کر دینا جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے نہ تو ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز ہے اور نہ بہت مشکل یا ناممکن مطالبہ ہے۔

ہندوستان کبھی ایک واحد ملک یا متحدہ قومیت کا گھوارہ نہ تھا۔ ہاں! باہر سے آنے والوں نے مختلف وقتوں میں اپنے سیاسی مصالح کیلئے اسے ایک بنا دیا۔ اس ملک کے آریائی باشندوں نے ان غیر ملکی فاتحوں سے دوستی کرلی، اور اُن کیلئے راستہ صاف کر دیا۔

ہندوستان میں جو قومیں آباد ہیں وہ کسی ایک نسل سے نہیں ہیں۔ یہ ایک ماں باپ کی اولاد نہیں کہے جا سکتے، کسی جیلخانہ کا داروغہ قیدیوں کا خاندانی بزرگ نہیں ہو سکتا، اور نہ وارڈر و برقنداز کو قیدیوں کا سرپرست کہنا صحیح ہوگا۔ بالکل اسی طرح برطانیہ یا آرین ہندوستان کے خاندانی بزرگ یا ہمارے سرپرست نہیں کہے جا سکتے۔

ہندوستان کبھی ایک قوم نہ تھا

جنکو فاطر ازل نے آنکھیں دی ہیں، وہ دیکھ رہے اور روزانہ ایسے نظارے ان کی آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں کہ جب کوئی بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کے مطالبہ تقسیم کو ٹھکرا دیتا ہے تو سارا کنبہ راحت و سکون کیلئے ترس جاتا ہے۔ اس طرح ایک بڑا بھائی سارے کنبہ کی پریشانی کا سبب بنجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ہندوستان کو نسلی بنیادوں پر منقسم نہیں کر دیا گیا تو نہایت سخت پریشانی اور درہمی اس ملک میں پیدا ہو جائیگی۔

مزید برآن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہندوستانی باشندے ایک مان کی اولاد نہیں بلکہ مختلف خاندان کے ارکان ہیں۔ جو مذہب، وطن اور عادات وغیرہ میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف واقع ہوئے ہیں۔ یہ متخالف اجزاء ایک دوسرے سے اسقدر متخالف ہیں کہ کسی طرح وہ مزعومہ متحدہ خاندان بن ہی نہیں سکتا جسکے تقسیم کی صورت میں تباہ ہو جانیکا اندیشہ ہو، یہ ایک ناقابل انکار اور مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان ماضی میں بھی کسی وقت متماثل الاجزاء خاندان کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

آرین، مسلمان اور ڈراویڈین کبھی ایک خاندان کے اجزاء نہ تھے

یہ تمام متخالف عناصر ایک دوسرے سے صرف اس لئے جوڑ دیئے گئے کہ یہ سب کے سب ایک ہی حکومت کے غلام ہو گئے۔ یہ نقلی اتحاد مسلم اور ڈراویڈین مفاد کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آرین کا اس سے ناخوش ہونا اور اس کی مخالفت کرنا ایک بالکل طبعی امر ہے کیونکہ ان کے مفاد اس نقلی اتحاد سے وابستہ ہیں اور تقسیم سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ اس ملک میں صرف آرین ہی وہ لوگ ہیں جو آرام و آسایش کی زندگی بسر کرتے ہیں باوجودیکہ صرف انھیں کو اس کا حق نہیں ہے اور مسلمان و ڈراویڈین کا یہ حال ہے وہ بیچارے صرف جان توڑ محنت و مزدوری کے کیا کرتے ہیں۔ یہ غیر منصفانہ صورت حال ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی بدل جائے گی۔

مطالبہ کا مقصد

غرض کہ تقسیم کا مطالبہ صرف اس امر کا مطالبہ ہے کہ ایک نسل دوسری نسل پر جو دستبرد کر رہی ہے اسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ ایک طبقہ یا نسل کیلئے دوسرے طبقہ یا نسل کو بطور آلہ کار استعمال کیا جانا آئندہ کیلئے بند ہو جانا ضروری ہے۔

آرین کو اس مسئلہ میں کچھ بولنے کا حق نہیں انکو یہ حق حاصل نہیں کہ

تقیسم کی تائید یا تردید میں ایک لفظ بھی بولیں۔

مسلمان مطالبہ کرتے ہین کہ جہان انکی اکثریت ہے وہان علیحدہ حکومت قایم کی جائے۔ ان کا یہ مطالبہ حکومت برطانیہ سے ہے، آرین سے نہیں ہے۔

آرین کی یہ کوششین کہ وہ ہمیشہ ملک کے تمام ذرایع پر قابض رہین اور دوسرون پر انکی دسبرد ختم نہ ہونے پائے بالکل ایسی ہے جیسے کسی امیر آدمی کا ایک ناجائز بیٹا دوسرے جائز وارثون کے شدید مطالبۂ تقیسم کے باوجود باپ کی تمام متروکہ جائداد پر قبضہ قایم رکھنے کی کوشش کرے اور کسی طرح اس کے لئے راضی نہ ہو کہ جائداد حسب حصۂ رسدی تقیسم کر دی جائے۔

ڈراویڈین کا مطالبہ

مسلمانون کی طرح ڈراویڈین بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان علاقون کی جو تاریخی طور پر اُن کے آباء واجداد کی حکومت میں تھے، اور جہان وہ خوش وخرم زندگی بسر کرتے تھے، ایک علیحدہ حکومت بنادی جائے بغیر اس کے ڈراویڈین نہ تو خوش وخرم زندگی بسر کرسکتے ہین اور نہ اُن کی ترقی کیلئے راہین کھل سکتی ہین۔ آرین کو اس کا کوئی حق نہیں کہ ڈراویڈین یا مسلمانوں کی ترقی کے راستون میں رکاوٹین ڈالین۔

آرین کا اس کے سوا کیا کارنامہ ہے۔ کہ انہوں نے مسلمانوں اور ڈراویڈین دونوں کے علاقوں کو برطانیہ کے ہاتھوں تباہ کرا دیا۔ اور کوشش کر کے ان علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ کرایا۔

واضح رہے کہ خود مسٹر گاندھی نے تو یہ کہا کہ اگر تقسیم ہندوستان کا حقیقی مطالبہ کیا جائے تو انکو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ ہوگا، کیونکہ کانگریس بھی اصول خود اختیاری ہی کیلئے لڑ رہی ہے، لیکن مسٹر راجہ گوپال اچاریہ کا یہ حال ہے کہ وہ اس مطالبہ کو ماں کے، گائے کے اور بچے کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ اور مسٹر ستیا مورتی کی رائے تو یہ ہے کہ ایسا مطالبہ کرنے والوں کو باہر نکال دینا چاہئے۔ مسٹر ساورکر کہتے ہیں کہ تقسیم کا مطالبہ کرنے والوں کو تشدد و قوت سے دبا دینا چاہئے۔

کوئی ان لوگوں سے پوچھے کہ آپ حضرات کس حق کی بناء پر اس قسم کی باتیں بنا رہے ہیں یہ ایسا ہی تو نہیں ہے جیسے کوئی شخص بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں لیکر دروازہ پر آئے اور کوشش یہ کرے کہ گھر کا داماد بن جائے۔

ویدوں کے زمانہ سے

یاد رکھنا چاہئے کہ آرین اور ڈراویڈین کا

جھگڑا اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود وید ہے۔ زمانہ قدیم سے آرین کے ہاتھون ڈراویڈین کو اتنی آفیتین اور اس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ وہ آرین کو حقیقی طور پر اپنا دشمن سمجھتے رہے ہیں۔ اسں کی شہادتین قدیم تامل کتابون میں بکثرت موجود ہیں۔

آج بھی یہ حال ہے کہ آرین، ڈراویڈین کو پیدائشی ذلیل، چنڈال اور اچھوت سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خدا ہی نے شاسترون مین اس قسم کا قانون بتایا ہے اس لئے تمام انسانون کو اس قانون کی اطاعت کرنی چاہئے۔ جب سے آرین نے اس زمین پر قدم رکھا ہے ڈراویڈین کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی اور صدیان گزر گئیں کہ اُن بدنصیبون کے لئے لکڑی چیرنے اور پانی کھینچنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ ان مظالم کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ڈراویڈین کو اپنے ڈراویڈین ہونے کا بھی یقین باقی نہ رہا۔ انہون نے آرین کو اپنا دہرم گرو اور سیاسی پیغمبر بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ کیا اس ذلیل اور حقارت آمیز صورت حال سے زیادہ ڈراویڈین کی اور کوئی تذلیل و تحقیر ہو سکتی ہے۔

ہندوستان بھارت دیس نہین ہے

ہندوستان کے علاقہ آریہ ورت اور ڈراویڈین کے مابین ایک جلی خط فاصل موجود ہے، ادبیات اور تاریخی کتابین ایسی ناقابل انکار شہادتیں

اپنے اندر رکھتی ہیں جن سے ماورائے شک وشبہ پر معلوم ہوتا ہے کہ، دونوں منقسم اور ایک دوسرے سے غیر متعلق حصے ہیں۔

ان تمام معتبر اور قابل انکار حقایق کے باوجود یہ کہنا صرف حماقت وابلہی نہیں تو اور کیا ہے کہ تامل ناڈ بھارت دیس کا ایک جزو ہے، کب اور کس زمانہ میں راجہ بھرت نے تامل ناڈ علاقہ پر حکومت کی ہے، تاریخ اپنے اندر کوئی ایسا زمانہ نہیں رکھتی کہ جب بھرت نامی کسی راجہ نے علاقہ تامل پر حکومت کی ہو۔ بلا شبہ کچھ زمانہ ایسا گزرا ہے جبکہ مسلمانوں نے اس علاقہ پر حکومت کی ہے، لیکن مسلمانوں نے جس طرح صدیوں آریہ ورت پر حکومت کی ۔ ڈراویڈین علاقہ پر اتنی طویل حکومت تو مسلمانوں نے بھی نہیں کی۔ البتہ یہ واقعہ تاریخ سے ثابت ہی کہ ڈراویڈی راجاؤں نے آریہ ورت کے مختلف حصوں پر ایک مدت تک حکمرانی کی ہے، لیکن کسی آریائی راجہ نے خصوصاً بھرت نامی کسی راجہ نے کبھی ڈراویڈین علاقہ (تامل ناڈ) پر حکومت نہیں کی آریوں کے پاس چونکہ سامان جنگ اچھا اور وافر تھا اس لئے ڈراویڈی فرمان رواؤں کے ورثاء عملاً اُن کے غلام ہو گئے اور آہستہ آہستہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نسل سے سمجھنے لگے، اس وقت ڈراویڈی ملک کو بھی آریائی نام دے دیا گیا۔

آرین سانپ یا من

اس وقت ڈراویڈی سوسائٹی کا ٹھیک اس مینڈک کا حال ہے جس کو سانپ آہستہ آہستہ نگل رہا ہو۔ یہ سانپ آرین دھرم ہے، یہ دھرم ڈراویڈی تہذیب وثقافت کو تباہ کر رہا ہے۔ بتائیے کہ یہ ڈراویڈی مینڈک اپنی جان کو کس طرح بچائے؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اس سانپ کو مار ڈالا جائے، جب تک آرین دھرم کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا جائے گا ڈراویڈی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، ان حالات میں کون ہے جو اس سانپ کو مار ڈالنا گناہ قرار دے؟

آج ڈراویڈین کا خود اُن کے اپنے علاقہ اور اپنے ملک میں کیا حال ہے؟ وہ لکڑہارے ہیں، وہ پانی کھینچتے ہیں وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں ایک ذلیل کتے سے زیادہ کیا حیثیت رکھتے ہیں، کسان وہ ہیں، مزدور ہیں، گاڑھے پسینہ سے روٹی کا ٹکڑا وہ حاصل کرتے ہیں۔ کیا تم میں سے کسی نہ کسی آریائی کو ہل چلاتے ہوئے، کھیت کاٹتے ہوئے، بیل گاڑی ہانکتے ہوئے اور چپراسی کی خدمت انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا تم نے کبھی کسی آریہ کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا ہے جس میں پسینہ بہ رہا ہو، بدن پر خاک گر رہی ہو، ناخنوں میں مٹی جم رہی ہو، سنو! یہ ہے آرین اور ڈراویڈین کی زندگی کا بنیادی فرق،

آرین ڈراوڈین مرد کو شدر اور ڈراویڈین عورت کو شدرچی کہتے ہیں آرین کے گھروں میں خدمت گزار ڈاویڈی ہیں۔ آرین، ڈراویڈین سے ہزار گونہ زیادہ دولت مند ہیں وہ سونا اور جواہرات سے کھیلتے ہیں، غریب ڈراویڈین کو شاید ہی نہایت سستے قسم کے زیور بھی میسر آتے ہوں، آرین میں (۹۰) فیصد اعلیٰ تعلیمافتہ ہیں، اور ڈراویڈین میں (۹۰) فیصد جاہل ناحرف شناس، ملازمتوں کا جہاں تک تعلق ہے ڈراویڈین چپراسی ہیں، ٹوٹھی ہیں، تھیلیدار ہیں، پولس کے سپاہی ہیں، اور (۹۰) فیصد کلکٹر، سپرنٹنڈنٹ، ہائی کورٹ کے جج آرین ہیں، اس طرح ڈراویڈین خود اپنے ہی ملک میں کتوں کی طرح ذلیل ہیں۔

کیا کانگریس نے ڈراویڈین کی حالت سدھارنے اور بہتر بنانے کی کبھی کوئی کوشش کی؟ اس مرض کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہ ہے کہ ڈراویڈی علاقے الگ کر کے آزاد و خود مختار حکومت بنادی جائے، جب علیحدہ حکومت بن جائے گی تو آرین، ڈراویڈین کے ساتھ شدر، ملیچھ، اور راکشش کا سلوک نہیں کر سکیں گے آرین پوچھتے ہیں :- ہندوستان کو کیوں تقسیم کرایا جائے۔

ڈراویڈین سوال کرتے ہیں :- ہم تمہارے ساتھ رہ کر ہمیشہ ذلت کی زندگی کیوں بسر کریں، کیوں نہ الگ رہ کر اپنا قدیم وقار و عزت حاصل

کریں۔

ہندوستان تقسیم ہو کے رہے گا۔ چاہے آریں اسے پسند کریں یا نہ کریں۔

آج بھی ہندوستان مختلف بااختیار حکومتوں پر منقسم ہے (۵۸۴) کے قریب ایسی ریاستیں جہاں برطانوی ہند کے قوانین جاری نہیں ہو سکتے ان کے علاوہ فرانسیسی ہند، پرتگالی ہند، نیپال اور افغانستان وغیرہ بھی ہیں، کیا کسی نے اس صورت حال کے خلاف کوئی آواز اٹھائی، کیا برما علحدہ نہیں ہوگیا، کیا سیلون (لنکا) الگ نہیں ہے، کیا ہندوستان میں گیارہ علحدہ علحدہ صوبے نہیں بنادئے گئے۔ کیا خود کانگریس نے مدراس پریسڈنسی کو تامل ناڈ اندھیرا دیس، کیرالا اور کرناٹک چار مختلف اور علحدہ ٹکڑوں پر تقسیم نہیں کر دیا۔

علحدگی کے فوائد کیا ہوتے ہیں۔ دیکھئے ٹراونکور اور میسور نے ثابت کر دیا کہ وہ الگ رہ کر کسقدر ترقی کر سکتے تھے، آج ان ریاستوں کو نمونہ کی ریاست سمجھا جاتا ہے فرقہ واری مناقشات کا جہاں تک تعلق ہے، ریاستوں میں اس کی اتنی نظیریں نہیں پائی جاتیں جتنی برطانوی ہند میں ہیں۔

سیلون اور برما ہندوستان سے علحدہ ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے باشندوں کی اچھی طرح خبر گیری کرنے کے قابل ہو سکے، انھوں نے اُن تمام اشخاص کو اپنے یہاں سے نکال دیا جن کو دستبرد کا مجرم سمجھتے تھے،

ڈراویڈین علاقہ میں مارواری، گجراتی، اور ملتانی (ہندو) معاشی دستبرد کر رہے ہیں مگر ڈراویڈین اُن سے یہ کہنے کے مجاز نہیں کہ وہ باہر چلے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایروڈے کے ملتانیوں نے ہندو مہا سبھا کو (۵۰۰) روپے دیئے، اتنی ہی روپے یلم کے گجراتیوں نے دیئے، اِن ہی گجراتیوں مارواریوں اور ملتانیوں نے لاکھوں روپے ڈراویڈین علاقہ میں ہندی زبان کے پرچار کیلئے دیئے اور ہر سال دے رہے ہیں، یہی دستبرد مچانے والے آرین ہندی پرچارنی سبھا کو تیس ہزار روپے سالانہ دے رہے ہیں یہ سب کچھ اسلئے ہو رہا ہی کہ دستبرد کی حالت کو دوام بخشا جائے۔ ہر سال کروڑوں روپے اسی معاشی دستبرد کے ذریعہ شمالی ہند کو چلے جاتے ہیں۔ ایک ڈراویڈی جب بمبئی جاتا ہے تو چمڑے کے گوداموں میں کام کرتا ہے۔ نہایت غلیظ غیر صحت بخش اور تکلیف دہ کوٹھری میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن جب پٹیل، ڈیسائی، برلا اور بجاج کے رشتہ دار مدراس آتے ہیں تو نوابوں اور راجاؤں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں،

یہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی، جب برما اور سیلون کی طرح ڈراویڈی علاقہ بھی علحدہ ہو جائے گا۔ اور ہمارے ساتھ شدر اور ملیچھ کا برتاؤ بھی تاریخ کا ایک بھولا ہوا واقعہ ہو کر رہ جائے گا۔

یہ سچ ہے کہ جسٹس پارٹی کے کچھ ممبر تقسیم کا ساتھ نہیں دیتے لیکن اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ ایک علیحدہ حکومت چاہتے ہیں بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بعض سیاسی مقاصد کی تکمیل کیلئے تجویز تقسیم کی مخالفت ضروری سمجھتے ہیں۔

برطانوی حکومت کو وقت گزر جانے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تقسیم کی یہ تجویز عام باشندگان کی ضرورت اور اُن کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ اور عوام اس تجویز کو مستقبل قریب میں عملی طور پر کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں، برطانیہ کو یہ حقیقت معلوم ہو جانی چاہئے کہ ڈراویڈین نے آرین سے علیحدہ ہو جانے اور اپنے کو غلامی سے نجات دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے، وہ اپنے اس مقصد تک خون کے دریا میں سے ڈوب کر جانے کو بھی تیار ہیں۔

ہندوستان کا صحیح حل

مسٹر گوپال چٹی سابق اڈیٹر "نیو ریفارمر" مدراس کا
مضمون مطبوعہ "دی سنڈے آبزرور" مورخہ ۵ر مئی ۱۹۴۰ء

جمہوری اصول پر ہندوستان کو سیاسی حقوق و اختیارات عطا کئے جانے کا مسئلہ اتنی عملی دقتوں سے پُر ہے، اور ہندوستان کے مذہبی و معاشرتی اختلافات سے اتنا گہرا تعلق رکھتا ہے کہ اس کا اچھی طرح سمجھنا آسان نہیں ہے، اسے صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ہندوستانی معاشرت کا اچھا طالب علم رہا ہو، اور اس کی ان گنت تفریقوں سے اچھی طرح واقف ہو، ہندوستانی معاشرت میں ذات پات، نسل و خاندان، اور گروہ جماعت کی اتنی تفریقات موجود ہیں کہ ان دشواریوں اور خطرات کا اندازہ لگانا جو اس سرزمین پر نمائندہ ادارہ جات کے قیام سے پیش آ سکتے ہیں بہت مشکل ہے،

باوجودیکہ یہ دشواریاں برطانوی حکومت کے علم میں لائی گئیں، لیکن پھر بھی اُس نے اپنا نظریہ تدریجی ارتقاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈھائی سال سے صوبہ جاتی خودمختاری کا ہندوستان میں نفاذ کردیا۔ حکومت برطانیہ کو امید تھی کہ "قومیت" کا وجود ممکن ہو سکے گا۔ اور کچھ دنوں کے بعد حقیقی معنوں میں نمائندہ ادارہ جات پیدا ہو جائیں گے، لیکن یہ سارا نظم ونسق کانگریسی وزارتوں کی غلط حکمرانی سے بالکل ناکام ثابت ہوا۔ اور اب حکومت برطانیہ کو اپنی اُس عظیم الشان غلطی کا احساس ہوگیا جو حالیہ اصلاحات کے نفاذ میں اُس سے سرزد ہوئی تھی۔

ابھی کچھ دن ہوئے کہ دارالامرا میں لارڈ ذٹلینڈ نے بیان کیا کہ کانگریس پارٹی نے بہت سے مسلمانوں کے دماغوں میں ایسے خطرات پیدا کر دیے ہیں جن کا دفعیہ صرف کانگریس ہی کر سکتی ہے، لارڈ کریو نے کہا کہ ان کے خیال میں کانگریس کے بہت سے انتہا پسند ممبر ایک ایسی حکومت قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق پسندیدہ حکومت (Popular Government) کی بجائے جماعتی حکومت (Oligarchy) سے مشابہ ہوگی۔

کانگریسی وزارتوں نے کبھی ایک منٹ کیلئے بھی یہ نہیں سوچا کہ معاشرتی ومذہبی خرابیوں کی اصلاح اور عوام میں تعلیمات کی توسیع کے ذریعہ ملک کی

جہالت کا دفیعہ اُن کے فرایض میں داخل ہے۔ شاید اس طرح وہ منتخب کنندگان اور منتخب نمائندگان دونوں کیلئے مفید ثابت ہوتیں، انھوں نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ مفلس طبقہ کی معاشی حالت کا سدھارنا اُن کا فرض ہے، بلکہ انھوں نے یہ کیا ڈراویڈین، اور مسلمانوں کو دباتے اور کچلتے رہے، اس طرح انہوں نے عدم اعتمادی اور خوف وخطرہ کیلئے جگہ پیدا کردی، اور نیتجہ یہ نکلا کہ اُن کے اس طرزعمل سے ملک میں اختلافات اور بھی بڑھ گئے۔ اور یہی اختلافات ازل سے ہندوستان کے لئے عذاب ہیں۔

یہ چونکہ طریقۂ انتخاب اور نمائندہ مجالس بالکل ناکام ہوچکی ہیں، ڈراویڈین اور مسلمان کانگریس کو مجوزہ مجلس دستورساز (Constiluent Assembly) پر آیندہ ذمہ دار حکومت کے سلسلہ میں کوئی اعتماد نہیں کرسکتے۔

ہندوستان کے اس الجھے ہوئے مسئلہ کا صحیح حل مسٹر جناح یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کو تقسیم کردیا جائے، ڈراویڈین اُن سے اس معاملہ میں بالکلیہ اتفاق کرتے ہیں، کانگریس اس سے اختلاف کرکے اپنی آپ تردید کررہی ہے، کیونکہ وہ خود بھی تو ہندوستان کو لسانی صوبوں پر تقسیم کردینے کی قائل ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے کشمکش میں شدت نہیں ہوگی، جب مختلف نسلوں کے لوگ ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں تو کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ لوگ الگ رہیں گے تو جھگڑا اور فسادکی

بنیاد ہی نہیں رہے گی۔

برما و سیلون سے قطع نظر کر کے موجودہ گیارہ صوبون کے علاوہ ہندوستان میں ایسی (۷۰۰) ریاستین ہیں جن کا حکومت ہند سے بذریعہ ایجنٹ راست تعلق ہے، اور ایسے کل علاقے جو دیسی ریاست کہے جاتے ہیں تقریباً (۷۰۰) ہیں، تجویز تقسیم کا مقصد صرف یہ ہی کہ گیارہ کی بجائے تین (۳) حصے قرار دئے جائیں۔

لارڈ اسنیل راستہ یہ بتاتے ہیں کہ

"ہندوستانیون کے دماغ میں مادر وطن سے وفاداری اور اُس پر ایمان کا ایک جدید مذہب پیدا کر دیا جائے وہ ہندوستان کو ایک ایسی چیز سمجھیں جو انھین متحد کرتی ہے، اور وہ اپنے خصوصی مذاہب کو ایسی چیز نہ سمجھیں، جو انھیں منقسم کر سکتی ہے۔

حقیقی اتحاد محال ہے

ہندوون اور مسلمانون کے مابین حقیقی اتحاد کا پیدا ہونا بالکل ناممکن ہے، ایک مرتبہ بڑی شد و مد سے اس کی کوشش اکبر نے شروع کی تھی اُس نے اپنے وقت کے بہترین اشخاص مثلاً ابوالفضل اور فیضی وغیرہ کو اپنے گرد جمع کیا، اُن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ ہندون کے مقدس نوشتون، شاسترون اور ہندو فلسفہ کی کتابون کا ترجمہ کریں، راجپوت نسل کا غرور

جے پور اور جودھپور کی راجکماریون سے رشتہ کر کے اعتدال پر لایا گیا، ان راجکماریون کو محل کی دوسری شہزادیون کے برابر بلکہ بلند مرتبہ عطا کیا گیا۔ خود شہنشاہ اپنے ہندو اور مسلمان مشیرون کی رہنمائی میں ان دو قومون کے مابین اتحاد کے بانی بن گئے، اور یہ پالیسی شہنشاہی دربار پر ایک سو سال تک مسلط بھی رہی۔ محسوس کیا گیا کہ ان دونون قومون کا امتزاج ایک جدید مذہب کے ذریعہ اور بھی زیادہ پائیدار ہوگا دین الہی کی بنیاد ڈالی گئی، اس میں ہندوون، مسلمانون اور دوسرے مذاہب سے اچھی اچھی باتین چن کر داخل کیگئین، اپنی رعایا کی دلدہی کیلئے اکبر نے گوشت کا استعمال ترک کر دیا، اور ہندو رانیون کے مذہبی تہوارون میں شرکت کی، اختلاف کی بنیادون کو مٹانے اور یگانگی پیدا کرنے کی یہ ساری ترکیبین کسی کی دخل اندازی کے بغیر ہی جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں خود بخود ختم ہوگئین۔ ان سارے انتظامات کے برخلاف ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہوتا گیا۔ ہندو خود آپس میں ایک دوسرے سے مل کر ایک قوم کبھی نہیں بن سکتے تو ہندوون اور مسلمانون کے آپس میں اتحاد کر کے ایک قوم بن جانے کی کیا امید ہو سکتی ہے ان حالات میں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہندوستان کو آریائی ہند، ڈراویڈی ہند، اور اسلامی ہند تین حصون پر تقسیم کر دیا جائے۔

ہندوستان ایک نہیں تھا

ہندوستان ہمیشہ سے ۵۶ حکومتون پر منقسم تھا' اور "انڈیا" کا لفظ ہندوؤں کو معلوم بھی نہ تھا' یہ تو وہ نام ہے جو انگریزوں کی آمد کے بعد دیا گیا ہے' اور آرین کے پاس اس کی بھی کوئی سند نہین کہ اسے "بھارت ورش" کہا جاتا تھا' ہمیں تاریخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "آر۔ ورت" شمالی ہند کے اس حصہ کا نام رکھا گیا تھا جہاں آرین بستے تھے' بالکل ابتدائی زمانہ میں کیپ کامرن اور ہمالیہ کے درمیان کا سارا ملک "تامل ناڈ" کہلاتا تھا' جیساکہ "پورانا نورو" کے ایک بند سے معلوم ہوتا ہے' اس کے بعد جیساکہ ایک دوسری کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ تامل' ڈنکٹم' کماری اور سمندروں کے مابین واقع ہے' اس طرح گویا تامل میں تریپاتھی کی پہاڑیوں سے کیپ کامرن' اور مغرب و مشرق میں ساحل سمندر تک کا وہ پورا علاقہ داخل تھا' جس میں آج کل کوچین' ٹراونکور' اور برطانوی ضلع مالابار بھی واقع ہے۔

کینیڈا اور السٹر

ہمین دیکھنا چاہئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس نسلی اصول کو کس طرح حل کیا گیا ہے' کینیڈا' اور السٹر اس طریقہ عمل کا بہترین نمونہ مہیا کرتے ہیں جس کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیا جاسکتا ہے' بلکہ حل کیا گیا۔

صوبہ کیوبے (Quebec) کے فرنچ کنا ڈین ڈومینین آف کینیڈا میں شریک ہو گئے، کیونکہ اس صوبہ میں ان کی زبردست اکثریت ہے اور یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ کوبے کی مجلس قانونساز میں اُن کو محض آلہ کار بنا لیا جائے گا۔ اسی طرح ائرلینڈ سے السٹر کے علاقہ کو کاٹ کر الگ کر لیا گیا کیونکہ آبادی کی اکثریت مذہباً پروٹسٹنٹ (Protestants) تھی، ۱۹۱۴-۱۸ کی جنگ کے بعد سے جو حکومتیں یورپ میں قائم ہوئی ہیں، وہ اسی ذہنیت اور طریقہ عمل کا پتہ دیتی ہیں، ریاست ہائے، لیٹیویا، اسٹونیا، اور لیتھونیا کے دستور بغیر کسی خرابی کے صرف اس لئے اچھی طرح جاری رہے کہ وہاں کے مسائل بالکل صاف ہیں۔ نسلی، مذہبی، یا فرقہ داری اختلافات اور کشمکش وہاں موجود ہی نہیں ہیں؛ یہ حکومتیں ایسی رعایا کی مرضی اور خوشنودی سے قایم ہوئی ہیں، جو مذہبی، نسلی، اور ثقافتی اتحاد رکھتی ہے،

دوسری وحدانی (Unitary) اور اساسی (Organic) حکومتوں مین بھی صورت حال یہی ہے، انگلستان، فرانس اور جرمنی کو دیکھ لیجئے، وسیع آبادی میں معاشی سوالات تو پیدا ہوتے ہیں، لیکن مذہبی یا نسلی اختلافات رونما نہین ہو سکتے، اب ذرا ان ممالک سے، قبل جنگ کی سلطنت "آسٹریا ہنگری" کا مقابلہ کیجئے، ہر وہ شخص جس نے اس سلطنت کے

دستور کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ روزانہ کس قدر سخت الجھاوے پڑتے تھے، اور کس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ ایک مضبوط پارلیمانی حکومت کا قیام ناممکن ہے، مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کی مرکز گریز قوتیں اتنی زبردست تھیں کہ دوران جنگ ہی میں حکومت مرکزی کا شیرازہ بکھر گیا، اور پوری شہنشاہیت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسی شہنشاہیت کے ویرانہ پر چیکوسلویکیا، اسٹریا، ہنگری، اور پولینڈ کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ قومیت اور تہذیب کے الجھے ہوئے مسائل نے اپنا حل تقسیم میں تلاش کر لیا،

نسلوں اور مقاصد کی جنگ اسٹریا ہنگری میں حکومت کی تقسیم و تحلیل پر ختم ہوئی اور مختلف نسلوں نے اپنی اپنی قومی حکومتیں بنائیں، شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ ان میں سے چار کو حالیہ جنگ میں فتح کر لیا گیا، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ سب کی سب اگر کسی ایک مرکز کے اندر پوری طرح آزاد حکومتیں ہوتیں تو کوئی انھیں فتح نہ کر سکتا، ان کی باہمی بے تعلقی نے انھیں تباہ کر دیا۔

ہندوستان کا معاملہ اسٹریا سے بہت ملتا جلتا ہے، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس سے بھی کسی قدر زیادہ گنجلک ہے،

ان حالات میں سب سے اچھا طریقۂ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ

ہندوستان کو، آرین ہند، ڈراویڈی ہند، اور اسلامی ہند، تین ٹکڑوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ انکے مفتوح ہو جانے کا خطرہ اس طرح روکا جائے کہ ان سب کو برطانوی سیادت میں رہنے دیا جائے، اگر ہندوستان بھی انگلستان، فرانس، اور جرمنی کی طرح ایک متجانس الاجزاء
(Homogeneous) ملک ہوتا، اور یہاں بھی مذکورہ ممالک کی طرح ثقافتی، معاشی اور سیاسی اتحاد ہوتا تو تقسیم کا سوال کبھی پیدا نہ ہوتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان ایسا نہیں ہے اور کبھی نہیں ہو سکیگا رہا مصنوعی اتحاد تو یہ کسی کام کی چیز نہیں،

دو ہندستان

مسئلہ پاکستان پر ایک مشہور انگریز کے خیالات

مسٹر پیٹرک لیسی (Patricklacy) کا مضمون مندرجہ جریدہ (Eastern Times) مورخہ ۲ر اگسٹ سنہ ۱۹۴۰ء

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور نے دو فوری اثرات مرتب کئے (اول) اس نے ہندوستانی اقلیتوں کے اس جذبہ کو اُبھارا جو کانگریسی قیادت پر فرقہ وارانہ تسلط کے خلاف موجود ہے (دوم) وہ آزاد ہندوستان کی اُس تجویز سے لوگوں میں دلچسپی پیدا کردی جو "پاکستان اسکیم" کہلاتی ہے۔

ہم لوگ یہاں انگلستان میں بیٹھ کر تجویز پاکستان پر تنقید تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کی تشریح ذرا بھی نہیں کرسکتے۔ عام طور پر اس تجویز کو مبہم الفاظ انڈین السٹر Indian Ulster سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی ہو جو اسے کما حقہ سمجھتا ہو۔ بعض لوگ ایک عالمانہ خواب بتاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آج تک ہندوں اور مسلمانوں میں اتحاد

پیدا کرنے کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ یہ تجویز ان دونوں کے باہمی اختلاف کو کم کر دے گی بہر حال اس تجویز کے موافق یا مخالف دلائل پیش کرنے سے پہلے ہمارا فرض ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لینے کی کوشش کریں۔

سائمن کمیشن، اور جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی
نے فرقہ وار مسئلہ کی توضیح کرتے ہوئے تمہید
میں لکھا ہے کہ "نسلی اختلافات" قوانین
کا مختلف ہونا، باہمی ازدواج کا فقدان
اختلاف معاشرت اور معاشی تقابل ان
اختلافات کے بنیادی وجوہ ہیں"

مسٹر جناح نے بھی اپنے خطبہ صدارت (اجلاس لاہور) میں ان ہی امور کو دہرایا ہے۔ اُن کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کی تجویز ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق کی حد تک مطمئن کر سکتی ہے۔ اس تجویز کے روبہ عمل آنے سے ہر فرقہ کو اپنے حالات کے مطابق ایک مناسب حکومت خود اختیاری میسر آجائے گی۔

اس بارے میں مسٹر جناح کی اوروں نے بھی تائید کی ہے، یہ تائید نہ صرف مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ہے بلکہ ان تمام لوگوں نے تائید کی ہے جو یہ مخالفانہ نظریہ نہیں رکھتے کہ ہندوستان پوری طرح صرف اس وقت

آزاد ہو سکتا ہے، یا ہونا چاہئے جب کہ یہ ایک ہی جغرافی وحدت یا وفاقی وحدتوں کا ایک ہی عظیم الشان مجموعہ ہو۔

اگر وہ کہتے ہیں کہ ایک مرکزی ذمہ دار حکومت کے ماتحت دوش بدوش رہ کر وہ آزادی کی طرف بڑھنا پسند نہیں کرتے، تو یقیناً ہندوں اور مسلمانوں کو اس کا موقع ملنا چاہئے کہ وہ الگ الگ رہ کر جہاں تک بڑھ سکتے ہوں بڑھیں اُن کے باہمی اختلاف کی وجہ سے انھیں رجعت قہقری پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستانی مسائل کو حل کرنے کی بہت سے مفکرین نے کوشش کی ہیں ان تمام مساعی میں "تجویز پاکستان" سب سے قدیم اور سب سے کم پیچیدہ ہے

تعداد اور قوت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ظاہری اسباب بھی اسی کے موٴید ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی گنجان آبادی، پنجاب، کشمیر، شمال مغربی صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، بلوچستان، خیرپور، اور بھاولپور کے علاقوں میں ہے، ان ساتوں علاقوں کے مجموعہ سے پاکستان تیار ہوگا، جس کا حکومتی مرکز لاہور اور بحری و فضائی مرکز کراچی ہوگا۔

اس کا رقبہ السٹر (Ulster) سے تقریباً ۵ گونہ، اور ہسپانیہ چیکوسلوویکیا، اسٹریا۔ البانیہ، بلجیم، ہالینڈ، سوئزرلینڈ، لیتھونیا، اور آئر کے مجموعی رقبہ کے برابر ہوگا،

اس کی آبادی البانیہ، آسٹریا۔ چیکوسلوویکیا۔ اور سوئیزرلینڈ کی مجموعی

آبادی کے برابر ہو گی (جرمنی کے علاوہ اور کسی نے بھی ان چھوٹے علاقوں کو خود مختاری کے لئے نا اہل نہیں سمجھا) یہ پاکستان صرف چوتھائی رقبہ اور آبادی کے ۱/۲ سے بھی کم حصہ کو ہندوستان سے علیحدہ کرتا ہے دوسری طرف بقیہ حصہ ہندوستان ہو گا۔ جس کی آبادی چین کے علاوہ دنیا کے کسی ایک ملک کی آبادی سے تقریباً تین گونہ ہو گی! اور اس کا رقبہ اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا میں ساتواں درجہ رکھے گا۔ اس حصہ کا دار السلطنت کلکتہ، لکھنؤ، یا مدراس کو بنایا جا سکتا ہے۔

یہ اندازہ ایک مابعد کی تفصیلی تجویز کا محتاج ہے۔

ان دونوں حکومتوں میں دولت عامہ کے مفاد محدود کی اُن ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لئے ایک ایک گورنر جنرل رہے گا۔ جو بالعموم صرف اظہار رائے تک محدود ہو نگی۔ تاج کی نمائندگی دہلی میں ہو گی۔ دہلی کا موجودہ صوبہ بہت ہی چھوٹا ہے۔ ہندوستان میں جو نقشے تجویز کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پنجاب سے قسمت انبالہ اور جالندھر کے بعض حصہ اس میں شامل کر دیے جائیں۔ ان حصوں میں اور صوبہ متحدہ میں متصلہ علاقوں میں ہندو اور سکھ مجموعی طور پر بڑی اکثریت رکھتے ہیں، وہ مسلم نظم و نسق کے ماتحت پاکستان میں ممکن ہے کہ چین سے نہ رہ سکیں اور اور اسی طرح پاکستانی حکومت بھی ان کی وجہ سے سکون محسوس نہ کرے

ان کا علحدہ کر دیا جانا، پٹیالہ اور دوسری سکھ ریاستوں کے حدود پاکستان میں میں رہنے کی دقت کو بھی ختم کر دے گا۔ صوبہ دہلی اس طرح وسعت کے بعد سوئٹزرلینڈ سے تقریباً دوگونہ رقبہ پر مشتمل ہوگا۔ اور دو بڑی حکومتوں کے درمیان ان کی فوجی سرحدوں پر ایک مفید حکومت حاجزہ Buffer state ثابت ہوگا۔ اور اپنے داخلی معاملات میں یہ صوبہ بین المملکتی Condominium حیثیت رکھے گا جسکا انتظام وائسرائے کے ماتحت ہوگا۔ اس میں صوبہ دہلی کے نمائندے اور پاکستان و ہندوستان کی مرکزی حکومتوں کے نامزد ارکان شریک ہوں گے۔

صوبہ دہلی کی اس حکومت کے سپرد جزیرہ نمائے ہند کی دفاع، بحریہ فضائیہ اور فوج کے بڑے حصہ کا نظم ونسق ہوگا۔ غالباً جنگی کی آمدنی بھی ان کے اخراجات کے لئے سپرد کرنی پڑے پاکستان اور ہندوستان، دونوں جگہ اندرونی نظم کے لئے چھوٹی چھوٹی فوجیں رکھنی پڑیں گی۔ دہلی کی غیر جانبدار حکومت کے ماتحت ایک اعلیٰ درجہ کی فوج کی موجودگی ایک دوسرے کے خلاف حملہ آور نہ ہونے کی ضمانت ہوگی۔ اس تجویز پر بہت سے اعتراضات ہیں۔ لیکن اس کے موئدین یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے پاس کم از کم اکثر اعتراضات کے جواب ہیں

جوابات

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کی ایک تہائی تعداد پاکستان کے قریب ترین حدود سے کئی سو میل کے فاصلہ پر بنگال میں

آباد ہے۔ جہاں اُن کی اکثریت ہے، اگر انھیں فراموش کر دیا جائے۔ یا ہندوستان کا جزو شمار کیا جائے، تو تجویز کا اصل مقصد کہاں باقی رہے گا۔ اس کے جواب میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کی رپورٹوں میں سے جو آراء اور پیش کی گئیں وہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین اختلاف پر زیادہ صادق آتی ہیں۔ اور تعداد کی کثرت اور اختلافات کی شدت کا جو معیار بتایا گیا ہے۔ وہ حقیقتہً ان کے بارے میں درست ثابت ہوتا ہے اگر ایک ہی وفاقی پارلیمان جس میں ہندوستان کے کثیر التعداد ہندو نمائندے پاکستان کے قلیل التعداد مسلم نمائندگان پر غلبہ رکھتے ہوں پورے ہندوستان کے معاملات میں دخل اندازی کا مجاز ہوا تو پاکستان اور ہندوستان کی متغائر خصوصیات کی بنا پر باہم گر سخت آویزش کا غالب امکان ہے۔ بنگالی مسلمان اور اس کے ہمسایہ ہندوؤں میں اس سے زیادہ امور مشترک ہیں جتنے پنجابی ہندو اور مدراسی ہندو میں ہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ بنگال کی مجلس قانون ساز میں توازن قوت یورپین کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صوبہ ہندوستان کے ایک جزو کی حیثیت سے بشتم بشتم کام کرنے کے قابل ہو سکیگا اگر یہ نہ ہو سکا تو اسے بھی دعوت دی جاتی ہے کہ برما کی طرح ایک دستور لے کر اپنے آپ کو علیحدہ کر لے یا دریائے برہمپتر کے مشرقی اضلاع کو پاکستان یا سلطنت

مشترکہ دہلی کی ایک خود مختار نو آبادی بنالے یہ گویا جسارت و بیباکی کے ساتھ مسئلہ کو اختتام تک پہنچانے کی سبیل ہے۔

(۲) **کشمیر** گو اس کی آبادی کم ہے لیکن رقبہ کے لحاظ سے یہ پاکستان کا ایک بڑا جزء ہے۔ یہ ہندو ریاست ہے۔ اس لئے کہ حکمران خاندان ہندو ہے لیکن یہاں کے ستم رسیدہ باشندوں میں سے ۹۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ پاکستان کی پوری اسکیم کا منشا کسی نہ کسی قسم کی جمہوری حکومت کا قیام ہے۔ تو توقع کیجاتی ہے کہ حیدرآباد جہاں ایک مسلمان خاندان بڑی ہندو اکثریت پر حکمران ہے ہندوستان کے ساتھ وفاق میں شریک ہوگا تو کشمیر پاکستان کے ساتھ کیوں نہ شریک ہو۔ محکمہ سیاسیات کے ڈرپوک کارکنوں کیلئے یہ تجویز اُس تجویز سے زیادہ قابل برداشت ہو سکتی ہے۔ جس میں رائے دی گئی ہے کہ مہاراجہ کشمیر اپنا تخت بھوپال کی ہندو اکثریت کے تخت سے تبدیل کرلیں

(۳) اس تجویز سے فرقہ وار مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد بھی دونوں ممالک میں اقلیتیں پھیلی ہوئی ہونگی۔ ایک سرسری حساب سے پاکستان میں کروڑ مسلمانوں کے مقابلہ میں ۶۰ لاکھ ہندو یا سکھ ہوں گے اور ہندوستان میں اگر بنگال شامل ہوا تو ۲۲ ½ کروڑ ہندوؤں کے مقابلہ میں ۵ ¾ کروڑ مسلمان ورنہ ۲۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ہندوؤں کے مقابلہ میں دو کروڑ ۷۵ لاکھ مسلمان ہونگے اس کے باوجود تقسیم کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی مذہبی و نسلی

تقسیم کے مطابق اس کے سیاسی جغرافیہ کی تشکیل، سب سے زیادہ عملی شکل
اور ہر قوم کو اس کی پسند کے مطابق دستور حکومت دینے کا واحد ذریعہ ہے
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس طرح مطمئن ہو چکنے کے بعد دونوں قوموں کا اپنی اپنی
اقلیتوں سے مناقشہ باقی نہیں رہے گا۔ اور ایک ملک کی اقلیت دوسرے
ملک میں اس کے ہم مذہبوں کے بہتر سلوک کی ضمانت ہوگی خیال بہت نازک
ہیں۔ لیکن موجودہ دستور یا کوئی اور دستور جو پیش کیا جائے لازماً خود
اختیار صوبجات میں، اسی قسم کی صورت حال پیدا کر دیگا۔ جب کانگریسی وزرائے
عہدوں سے سبکدوش ہوکر ذمہ داری پھر برطانوی عہدہ داروں کے ہاتھوں
میں دے دی۔ تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے شکر گذاری کا ایک خاص
دن منایا تھا کہ انھوں نے کانگریسی حکومت سے نجات پائی۔ ان کا کہنا ہے
کہ پورے ہندوستان کی واحد وفاقی حکومت اور واحد پارلیمنٹ کے تحت مسلمان
خاص اپنے صوبوں میں اور ان صوبوں کے باہر دونوں جگہ ہندوؤں کے رحم
و کرم پر ہوں گے۔ وہ ہندو اکثریت کے محکوم بننے سے اسی طرح ابا کرتے
ہیں۔ جس طرح فلسطین کے یہودی وہاں کے عرب اکثریت کی حکمرانی کے
خیال سے متنفر ہیں۔ اور ہندوستان جو فلسطین سے (۱۸۰) گنا بڑا ہے تقسیم
کے بہتر امکانات بہم پہنچاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جناح اور ہندو صوبجات
کے دوسرے مسلمان پاکستان کے حامی ہیں۔ حالانکہ ان صوبجات میں اس سے

انھیں براہ راست کوئی فائدہ نہیں ہے۔

(۴) آیا پاکستان اپنے مالی بار کو خود اٹھانے کے قابل ہو گا؟

راسخ العقیدہ معاشین کہتے ہیں "بجز اس کے کہ پنجاب ہندوستانی فوج کی ریڑھ کی ہڈی بنا ہے" اور یہ فرض کرنے کی وجہہ موجود ہے کہ وہ بنا رہیگا) یہ ممکن نہیں جب سر آٹو نیمیر نے مرکز اور صوبجات کے مابین تقسیم کے متعلق سفارشات پیش کی تھیں تو پنجاب ہی جہاں پاکستان کی دو تہائی آبادی ہے، ایک ایسا صوبہ تھا۔ جس کے متعلق معلوم ہوا کہ اُسے مرکز سے رقم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ راسخ العقیدگی کی جانب سے ہلاکت کا فتویٰ صادر ہونیکے بعد بھی قومیں کسی نہ کسی طرح عرصہ تک گزر بسر کر سکی ہیں، کشمیر کی ترقی (جس کے مہاراجہ کو حقیقتہً وائسرائے سے ۱۲ گنی تنخواہ کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی) جدید ذرائع آبپاشی سے سندھ کی خوشحالی اور سرحد پر مستقل امن کے قیام بھی وہ چیز ہے جس سے توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔

سرحدی شورش کا علاج

نسبتہً کم فرضی اعتراضات کے ان تمام نظری جوابات میں سے آخری جواب بہت دلچسپ بحث کا طالب ہے کیونکہ یہ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ پاکستان کی تجویز شمالی مغربی سرحد کی قبائلی شورشوں کا علاج ثابت ہو گی سرکاری الفاظ ہیں "اب وقت آچکا ہے کہ شمالی مغربی سرحد کے متصل جو

قبائلی علاقہ ہے اسے زیر اقتدار لایا جائے یا دفاع کے اغراض کے لئے منظم کیا جائے" خیال تو بہت ستھرا ہے، لیکن یہ تجویز پچاس سال قبل حکومت ہند نے حکومت پنجاب کو لکھی تھی۔ اس وقت اس کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ گزشتہ جولائی میں پارلیمنٹ میں بیان کیا گیا کہ فلسطین کے سات سال کے ہنگاموں میں فوج اور ہوائی عملہ میں سے (۱۱۳) آدمی مارے گئے اور (۲۰۷) زخمی ہوئے ان حادثات کا حال سنکر لوگ بہت پریشان ہوئے اور خوفزدہ ہو کر انہوں نے رائے دی کہ فلسطین میں ہمیں بیس ہزار فوج رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوا کہ وزیریوں کے خلاف دو سال کی غیر مختتم مہم میں ہمیں چالیس ہزار سے زائد سپاہی لگانے پڑے جن میں سے (۳۰۶) مارے گئے (۸۸۸) زخمی ہوئے۔ اور اس وقت جب کہ ایک ایک آدمی ایک ایک ہتھیار اور ایک ایک پیسہ کی جرمنی کے خلاف جنگ کے لئے ضرورت ہے اور ہر جگہ، ہر شعبہ میں کفایت شعاری کی تلقین کی جا رہی ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مسلسل تین سال کی جھڑپیں وزیرستان میں سکون قائم کرنے کے لئے کافی ثابت نہ ہوئیں۔ بلکہ احمد زئی فتنہ کو دبانے کے لئے ایک نئی مہم بھیجنا پڑی۔

اس وقت جبکہ موجودہ جنگ جاری ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی چیز

معلوم ہوتی ہے۔ گزشتہ سات سال کی سولہ مہموں یا فوجی مظاہروں میں بحیثیت مجموعی نہ اتنا خرچ ہوا ہو گا جتنا ہمیں یورپ کی (۳۶) گھنٹوں کی جنگ میں خرچ کرنا پڑتا ہے اور نہ اتنا جانی نقصان ہوا ہو گا جتنا ہمیں اپنے بحری جہازوں، 'کریجس' اور 'رائل اوک' کی غرقابی میں برداشت کرنا پڑا لیکن جتنی رقم صرف ہوتی ہے وہ ہندوستان کیلئے بڑا مالی بار ہے اور از روئے دستور ہندوستان میں تمام فوجی اعمال کی ذمہ داری ابتک برطانیہ ہی پر ہے۔ سرحدی سرخ پوشوں کے لیڈر، عبدالغفار خاں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ میری کانگریس سے وابستگی ایک مصلحت ہے اور جوں ہی کانگریس پٹھانوں کے تصور آزادی سے تعارض کرتی ہوئی معلوم ہوئی اسے ترک کر دیا جائیگا۔ اس لئے کہ ہمیں ہندوستان سے کیا تعلق ہے اگر خاص برطانوی ہند کے ایک پٹھان کے یہ خیالات ہیں اور اگر سائمن کمیشن، جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی اور مسٹر جناح کی آرا رحق بجانب ہیں تو ہم قبائلی علاقہ کے پرجوش مجاہدین اسلام سے کسی طرح یہ توقع وابستہ نہیں کر سکتے کہ دہلی میں ہندو اکثریت کے ووٹوں سے جو قوانین بنا کریں گے اسے وہ قبول کرلیں گے۔ اگر کسی بیرونی حاکم کی اطاعت کا سوال ہو تو خواہ خود قبائل ہی کے بھلے کے لئے ہو یا مفاد عامہ کیلئے لیکن صرف کثیر افواج کے ذریعہ نشدو کے بغیر ان کی اطاعت پذیری یا نہیں ہندوستان سے وابستہ

کرنا ممکن نہیں، مدراس، بمبئی، بہار اور یو پی وغیرہ کی ہندو اکثریت والی حکومت بھی انھیں کم از کم اتنی بیگانہ تو ضرور معلوم ہو گی کہ جتنی کہ برطانیہ کی موجودہ رشوت، رفاقت اور توپخانہ کی معجون مرکب۔ لیکن ان کے ساتھ بھی مساویانہ سلوک روا رکھیے۔ انھیں خود اپنے علاقہ میں آزادی سے بسر کرنے دیجیے اور موقع دیجیے کہ ان اصول کے مطابق جن کی ان کے دلوں میں قدر و عظمت ہے، لاہور میں ایک اسلامی حکومت قایم ہوتے ہوئے دیکھیں، پھر دیکھیے کہ یہ اسلامی حکومت جتنا دباؤ ڈال سکتی ہے ضرور ہو گا۔ ڈال کر انھیں کس طرح تعاون پر آمادہ کر لیتی ہے۔ اس وقت وہ ذمہ داری میں شریک اور ایک مہذب نظم حکومت کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان کو معرض وجود میں لائے بغیر بھی یہ ممکن ہے، دوسری جماعت بھی ایقان رکھتی ہے کہ دہلی میں قایم شدہ بیگانہ اور قہر حکومت کے تسلط سے یا تو قبائل ابتدا ہی میں خوفزدہ ہو جائینگے۔ یا پھر وہ اس قسم کی صوبہ جاتی خود مختاری سے محروم ہو جائیگے۔ جس سے پورا ہندوستان وابستہ ہو گا۔

پاکستان کوئی جنت خیالی ہو۔ یا اس سے بھی بدتر کوئی چیز۔ اس کے خلاف دلائل کے لئے کسی اشتہار کی ضرورت نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ چند در چند وجوہ کی بنا پر مخالفت اور موافقت سے بے نیاز ہو کر یہ تحریک ایک خاص انداز سے برابر مقبولیت اختیار کرتی جا رہی ہے، یہ قیاس غلط ہے

کہ ہندو سب سے سب اس کے خلاف ہیں اور ہمیشہ مخالفت پر آمادہ رہینگے اگر ہم اسے خواب وخیال سے بھی بدتر کوئی چیز خیال کرتے تو اس پر حملہ کرنے کے لئے آخری مورچہ تک پرواز کر کے جانچ کرنا چاہئیے۔

مصنوعی وحدت ہندوستان کی وحدت ایک مصنوعی چیز ہے جو ایک وحدانی طرز حکومت کا نتیجہ ہے جسے باہر سے ہندوستان کے سر تھوپا گیا ہے۔ جس قوت نے ان کو جکڑ کر ایک وحدت قایم کر دیا ہے، خواہ عام رضامندی کہئے خواہ اطاعت، یا خلاف منافرت، ممکن ہے کہ یہ وحدت اچھی چیز ہو، لیکن نہ تو یہ اس ملک کی پیداوار ہے اور نہ یہاں والوں کی فطرت کے موافق ہے۔ انگریز ہندوستان پر اس لئے قابض ہو سکے کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے تھا، انھوں نے اس کا ایک بڑا حصہ مسلمان مغلوں سے لیا ہے۔ انھوں نے مختلف ہندو سرداروں سے جنگ کی، کبھی مسلمان حلیفون کے ساتھ ملکر فتح حاصل کی اور کبھی ہندو حلیفوں کے ساتھ سوائے اس سکون کے زمانہ کے جو برطانوی حکومت کا پیدا کردہ تھا۔ کلکتہ سے ٹرنیوںڈرم اور کوئٹہ سے کلکتہ تک کا ملک کبھی ایک نہیں ہوا۔ بہت سی خلیجیں اور خندقین پٹ چکی ہیں اور غالباً ہمیشہ کے لئے۔ لیکن ہندؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلافات اسی طرح باقی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ باقی رہنا ہی چاہیے، جس طرح برطانیہ کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ بوہیمیا کو جرمن ثقافت کا تابع بنانے

کے لئے امداد دے بالکل اسی طرح اوس کا یہ کام بھی نہیں کہ ہندوستان
میں ان دونوں تہذیبوں میں سے ایک کو دوسرے کا تابع بنا دے، اجنبی حکومت
کا بندھن اب ٹوٹنے والا ہے اور قبل اس کے کہ تشتت کے تازہ رجحانات میں
بندھن کے ٹوٹنے پر زور شور سے کام کرنے لگیں۔ ہندوستان کو ممکنہ حد تک
اس کی قدرتی تقسیم کے مطابق منصفانہ اور محفوظ طریقہ پر اُن باہم رفیق دعویداروں
میں تقسیم کے مسئلہ پر غور کرنے کی گنجائش ہے۔ جن سے انگریزوں نے حاصل کیا تھا
اور جنہوں نے دوسرے کو بیدخل کرنے میں برطانیہ کی مدد کی تھی،

ایک گفتگو میں جو نو سال قبل اخبار مانچسٹر گارجین میں شائع ہوئی تھی،
مسٹر گاندھی نے افسوس کے ساتھ اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے یہ امکان ظاہر
کیا تھا کہ آزادی اُن کے ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں ڈھکیل دے گی جس کا
نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو تباہ کر دے گا۔ اگر امکانات یہ ہیں
اور اس کا بدل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم دو برائیوں میں سے کمتر کو اختیار کریں
تو ہمیں اسی وقت فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ہم کونسا راستہ اختیار کریں گے۔ اس
لئے بہتر ہوگا کہ ہم متفق اللفظ ہو کر یہ کہیں کہ ایک اجنبی حکومت کی لعنت کے تحت
خانہ جنگیوں کا عظیم الشان اکھاڑہ قائم کرنے کی بہ نسبت ہم اسے بہتر خیال کرتے
ہیں کہ ہندوستان میں دو ایسی مملکتیں قائم ہو جائیں۔ جن میں سے ہر ایک
زیادہ سے زیادہ حد تک متحد العناصر ہو۔

ایک علیحدہ اسلامی حکومت کی ضرورت

خان عبدالرحمن خان ایم ایل اے کھام گاؤں برار کا
مضمون مطبوعہ Eastern Times مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۰ء

آل انڈیا مسلم لیگ کی تجویز لاہور کے خلاف جو تنقیدیں ہو رہی ہیں۔ اُن میں مجنونانہ غضب، استہزاء، اور غیر متوازن حالت دماغی کی کیفیت ظاہر ہے، یہ لوگ پھر وہی غیر مصالحانہ روش کا اظہار اور حقایق سے چشم پوشی کر رہے ہیں، وہ مسلمانوں کے موقف اور انکی ذہنی کیفیت کی طرف سے بے توجہی برت رہے ہیں، یہ ہے تجویز کا اولین ردعمل، ہمیں امید کرنا چاہئے کہ دوسرا درجہ پرسکون اور ٹھنڈے دل سے غور کرنیکا آئیگا۔ لیکن ان ناقدین کو معلوم رہنا چاہئیے کہ سخت الفاظ سے ہڈیاں تو نہیں شکستہ ہو جاتی ہیں مگر دل ضرور ٹوٹ جاتا ہے اور ایسا ٹوٹ جاتا ہے کہ پھر اسے جوڑا اور مرمت نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مدت تک التواء اور تامل کے بعد جب کہ سب یہ پوچھ رہے تھے کہ آخر لیگ چاہتی کیا ہے، لیگ نے ایک ٹھوس ممتاز اور نہایت ہی معقول اسکیم پیش کر دی، اسطرح لیگ نے اپنا پتہ میز پر ڈال دیا۔ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی ابھی تک سیگاؤن کی مبہم فضا کا ایک خواب بنا ہوا ہے، صرف وہی اپنے مبہم انداز میں اسے تاریکی سے

باہر لا سکتے ہیں، اور دوسرا کوئی نہیں جانتا کہ اس مکمل آزادی کا مطلب کیا ہے۔

باوجودیکہ ایک ہزار سال کی طویل مدت سے ہم ہندوستان سے متعلق ہیں لیکن اب تک ہمارے ہم وطنوں کو ہماری تاریخ ہماری روایات، ہماری نفسیات ہماری سوسائٹی کی نوعیت اور اُس کے اجزاء ترکیبی، ہمارے معتقدات اور ہماری ذہنیت سے بے خبری ہے۔ بارہا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے دیدہ و دانستہ بے خبری برتی اور ہمیں غلط سمجھا جاتا ہے، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے شاید ہندوؤں اور انگریزی شہنشاہیت نے مسلمانوں کی بربادی کیلئے سمجھوتہ کرلیا ہے اور معاشی دستبرد میں ایک دوسرے کے سہیم بن گئے ہیں۔ یہ دونوں کے لئے مفید تھا، اور منافعہ بھی دونوں میں مشترک رہا۔ مسلم اقتدار کے آخری دور تک بھی مسلمانوں کا اثر و نفوذ کوئی نہ کوئی وجہ نکال کر مٹایا گیا، ہندوؤں نے اس کام میں کمی کو پورا کرنے کیلئے اپنی رضاکارانہ خدمات سے کبھی دریغ نہیں کیا، آقاؤں کی تبدیلی بھی ان کیلئے کچھ کم منافع نہ تھی، مسلمان جو ابھی ڈیڑھ سو سال پہلے تک اس ملک کے فرمان روا تھے آج بھکاریوں سے بہتر حال میں نہیں ہیں۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں کبھی معاشی دستبرد نہیں مچائی بلکہ بہت کچھ اس کی دولت، خوشحالی، اور ترقی میں حصہ لیا یہاں تک کہ ہندوستان ایک جنت ارضی ہوگیا۔ لیکن جب سے برطانوی حکومت شروع ہوئی ہے۔ انکے ساتھ غیر ملکیوں کا سلوک کیا جانے لگا اور انھوں نے جو صدیوں تک حکومت کی ہے اسکا نام رکھا گیا، دہشت، خون ریزی،

گاؤکشی، مندروں کی بربادی، جبریہ تبدیل مذہب، لوٹ مار، اور ملک کے لوٹ کھسوٹ کا زمانہ اس ملک کا نقشہ یہ بتایا جاتا ہے کہ تیمور جیسا جبار، علاؤالدین جیسا سیاہ کار، تغلق جیسا دیوانہ، بابر جیسا نشہ خوار، ہمایون جیسا افیونی، جہانگیر جیسا سہل انگار، اکبر جیسا لامذہب، شاہجہان جیسا اولاد کش اور اورنگ زیب جیسا ہندو کش حکمرانی کر رہا ہے یہ ہے ہماری ان لاثانی خدمات کا صلہ جو ملک کی تاریخ میں عدیم المثال شان و شوکت کا باعث تھیں۔

برطانوی دور سے پہلے کا ہندوستان فرقہ وار سوال سے خالی ہے، تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب کہ جنگ فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوئی ہو۔ لیکن حالیہ دور میں قومیت کا قصور ہندوستان میں فرقہ واریت کی راہ سے آیا، اور اس کی پرورش مسلمانوں کے خلاف بُرے ارادے اور دشمنی کے جذبات سے ہوئی۔

ہندوستان میں قومیت مغربی تصورات سے مستعار لی گئی ہے، منطقۂ زمہریر کا یہ پودا خط استواء کی چٹان میں لگا کر اس کے پھولنے پھلنے کی سعی کیجا رہی ہے۔ یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے، پھر کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ یہ پورا سرسبز ہو کر پھل نہ لا سکا، بہرحال یہ ضرور ہوا کہ باغ کے دوسرے کارآمد درختوں کو اس نے تباہ کر دیا۔ قومیت کا یہ دوغلا بچہ برطانوی شہنشاہیت کا متبنیٰ ہے اور اب کوشش کر رہا ہے کہ یہاں جائز وارثوں کو انکے جائز قبضہ سے بے دخل کر دے۔

قومیت ہندو کی جدید ذہنیت کی ایک دماغی عیاشی ہے نہ تو یہ غیر جانبداری کے

خیالات کی پیداوار ہے اور نہ مقامی افراد کی ذہانت و فطانت کی۔ قومیت سے پہلے ایک قوم ایسی فرض کیجاتی ہے، جس کی تاریخ، روایات، معتقدات، مفاد اور عواطف وجذبات ایک ہوں۔ اس کی بنیاد قایم ہوتی ہے انسانی مساوات، آزادی اور شہریت کے برابر حقوق پر، مسلمانوں کو چھوڑئے کیا خود ہندوں کی مختلف ذاتین اور طبقہ جات قومیت کے ضروری شروط کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی دور سے پہلے قومیت کا کوئی تصور موجود نہ تھا، اور نہ کبھی یہ ایک ملک تھا، آج بھی ایک ملک نہیں ہے۔

آریہ ورت نے پنجاب کے حدود سے زیادہ کبھی وسعت نہ پائی یہی پانچ دریاؤں کی زمین ہے جو ویدوں کو گھر رہی ہے، بھارت ورش نے کبھی بندھیا کی گھاٹیوں کو عبور نہیں کیا۔ مگر وہ دیس کبھی ہندوستان نہیں کہلایا۔ مسلمانوں کے دور میں یہ جزیرہ نما، ہند، سندھ اور دکن تین ٹکڑوں پر منقسم تھا۔ پھر ہندوستان کیا ہے، کیا یہ ایک ملک ہے، نہیں! بلکہ یہ ایک جزیرہ نما ہے، یہ قوموں کا ایک مجموعہ ہے۔ پنجاب اور بنگال میں راجپوتانہ اور مہاراشٹر میں، ڈراوڈین دیس اور آریہ ورت میں کیا چیز مشترک ہے۔ اسی طرح برطانوی ہند، اور ریاستوں کے مابین، مسلمانوں اور ہندوں کے مابین، برطانوی انتظام کی وحدت کے علاوہ اور کیا چیز مشترک ہے؟ ہندوستان نہ تو کسی ملک کا نام ہے اور نہ کسی قوم کا، یہ تو برطانوی حکومت یا یوں سمجھئے کہ برطانیہ کے فوجی قبضہ کے حدود کا دوسرا نام ہے، اس رقبہ کا ۱/۳ یعنی ہندوستانی

ریاستین، ہندوستانی قومیت کا جزو نہیں ہیں، اور بقیہ حصہ بھی ۱۹۳۵ء کے دستور کے میں خود مختار صوبوں پر منقسم ہے۔

اس طرح ہندوستانی قومیت وہ شئے ہے جس کی ابتدائی بنیادین یعنی عمومی معاشرت، مذہب، سیاست، معاشی مساوات اور حقوق سرے سے معدوم ہیں، قومیت کا نصب العین حاصل کرنے میں سب سے بڑی روکاوٹ خود ہندوسوسائٹی کا نظام ہے، جسمین برتری وکمتری کا دوامی تصور موجود ہے، کوئی ہندو دوسرے ہندوون کے برابر حقوق لیکر نہیں پیدا ہوتا اور نہ وہ کبھی اپنی آئندہ زندگی میں اکثریت کا مرتبہ حاصل کرنیکا حق رکھتا ہے۔

کانگریس جو چھ سو ریاستون کو جمہوری بنانا چاہتی ہے، اور خواہشمند ہے کہ مسلمان اپنی انفرادیت کو ختم کر کے ہندو قومیت میں جذب ہو جائین، پہلے اپنے گھر کو تو درست کرے، اسے چاہیئے کہ ہندوسوسائٹی کو تحلیل کر کے پہلے ایسی بنائے کہ ہندوستان جمہوریت کے قابل ہو سکے، اور بغیر اس کے تو قومیت کا مطلب صرف برہمن کا تفوق اور سوراج کا مطلب برہمن اور بنیا کا مشترکہ راج سے زیادہ کچھ نہیں۔

کانگریسی جمہوریت کی فرقہ پرستی

جہان تک فرقہ وار مسئلہ کا تعلق ہے گورنرون کی حکومت (Diareny) ۱۹۳۵ء کی صوبہ جاتی خود مختاری سے کم آفت رسان تھی، ایک تیسری جماعت کی موجودگی اکثریت کو ہمیشہ ہوش وحواس میں رکھتی تھی۔ مگر جیسے ہی کہ جدید دستور کے ماتحت انتخابات ختم ہوئے ایک شور اٹھایا گیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیان ہیں ایک طانوی حکومت

اور دوسری کانگریس، اِس نعرہ نے مسلمانوں کو سیاسی میدان سے بالکل باہر کر دیا اور ہندوستان کے نقشہ سے اِن کا وجود ہی محو کر دیا گیا۔ حقیقت پر اگر نظر کی جائے تو جہاں تک صوبہ جاتی خود مختاری کے عمل کا تعلق ہے دو پارٹیاں موجود تھیں ایک مسلمان اور دوسری ہندو، سنہ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کا یہ فائدہ کانگریس کے دماغ میں موجود تھا کہ مسلمان ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں حالانکہ واقعہ یہ نہ تھا حکومت ہند کو اس کا اقرار ہے کہ مسلمان اگرچہ چند صوبوں میں اقلیت ہیں تو ہندو بھی چند صوبوں میں اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں، اقلیتوں کے ساتھ مراعات اور ان کے لئے تحفظات دونوں کیلئے تھیں، کسی ایک کیلئے نہ تھیں مسلم لیگ نے نہایت خوشی کے ساتھ اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت رکھتے ہیں ہندوؤں کو وہ حقوق دے جو دوسرے صوبوں میں وہ مسلمانوں کیلئے طلب کر رہی تھی، لیکن کانگریس کی تصوریت نے اپنی بنیاد ایک دوامی ہندو اکثریت پر رکھی، کانگریس نے ہندوستان کے کسی دستور میں بھی یہ تصور نہیں چھوڑا کہ ہندو یہاں اکثریت رکھتے ہیں، اور اُن ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ ہندوستان پر حکمرانی کریں، کیوں صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ اقلیت کا برتاؤ کیا جائے؟ اور کیوں نہ ہندوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہو، کانگریسی لغت کے بموجب مسلمان اور اقلیت دونوں ہم معنی الفاظ قرار پا گئے، سوال یہ ہے کہ ہندوں کو کیوں نہ اقلیت کہا جائے جب کہ وہ صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب، بنگال اور کشمیر میں اقلیت ہیں، کانگریس نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ اقلیت کا برتاؤ کیا، اور اس طرح اس نے عملاً یہ اقرار کر لیا کہ ہندوستان میں ایک

قوم آباد نہیں ہے"، کانگریس بھول گئی کہ مراعات اور تحفظات صرف مسلمانوں ہی کو نہیں ملتی ہیں، بلکہ انھوں نے مسلم علاقوں میں یہی مراعات بلکہ ان سے زیادہ موثر تحفظات ہندوؤں کو عطا کئے ہیں۔

یہ حقیقت کہ کانگریس کے نزدیک ہندوستان سے مراد "ہندو انڈیا" اور قوم سے مراد ہندو قوم ہے، اور جمہوریت کا مفہوم در اصل ہندو اکثریت کی حکومت ہے، سات صوبوں میں ڈھائی سالہ کانگریسی حکومت کے ذریعہ پوری طرح وضاحت کے ساتھ ثابت کردی گئی۔ مسلمان ہندوستانی سیاست میں شمار سے باہر کردئے گئے، چار آنے کی ممبری کا ضابطہ اس لئے تھا کہ ہندو اکثریت کی حکومت کا یقین حاصل رہے "ہندو راج" کے قیام کا اعلان مظاہروں سے کیا گیا، کانگریسی جھنڈے لہرائے گئے، بندے ماترم کا ترانہ گایا گیا اور اس فسانہ کو زور شور کے ساتھ پھیلایا گیا کہ صرف کانگریس کی تنظیم، کانگریسی جماعت، اور کانگریسی نصب العین ہی زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے۔ دوسرے یا تو ماتحت بنکر رہیں یا ذلیل و خوار بن کر، ورنہ پھر خودکشی کریں، ممکن ہے کہ اس طرز عمل کو معقول کہا جائے اور بتایا جائے کہ یہ بھی برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جنگ تھی، اور اسی کیلئے، لوگوں کو قربانی کی دعوت دی جارہی تھی، لیکن جہاں تک دستور کو روبعمل لانے کا تعلق ہے اور اس کا تعلق ہے کہ اس ذریعہ سے کوئی اپنی صلاحیت حکومت کا ثبوت بہم پہنچائے۔

کانگریس نے نہ صرف اپنے کو ایک فرقہ وارادارہ ثابت کیا بلکہ جابر، ظالم،

اور مطلق العنان بھی، بلاشبہ کانگریس کا دروازہ کھلا تھا لیکن کس کیلئے؟ صرف ہندوں کیلئے تاکہ اُن کے موقف کو مضبوط تر بنایا جائے، اور چار آنے کی ممبری کے مقابلہ میں عہدے، قوت، اور حیثیت کو اُنکے ہاتھ فروخت کیا جائے۔ حالیہ دو سال کے اندر کانگریس کی توسیع لوگوں کے کانگریس پسند ہو جانے یا کانگریسی نصب العین کی ہر دلعزیزی کی رہین منت نہ تھی بلکہ صرف اقتدار کی دلفریبی اپنا کام کر رہی تھی۔ کانگریس نے سمجھ بوجھ کر اپنا پروگرام وہ بنایا تھا جو ہندو کی ذہنیت کو اپیل کر سکے اور ہندوں کیلئے مذہبی اصلاح کا موقع مہیا کرے، کانگریسی جھنڈے، گاندھی جی کی مورتی، اور سرسوتی (علم کی دیوی) کی پرستش، درگاوتی اور سرسوتی کی مورتیوں کا اسکولوں میں رکھا جانا، کانگریسی لیڈروں کی ارتھی، دیہات سدھار کی تنظیم دیہی صنعتوں کی پذیرائی، چرخہ پرچار، سنسکرت آمیز ہندی کی اشاعت، واردھا اور ودیا مندر تعلیمی اسکیمیں، گاندھی جی کیلئے سرکاری طور لقب "مہاتما" کی تجویز، گاندھی جی کی سالگرہ اور تلک کی برسی کو سرکاری تہوار قرار دینا، یہ ہیں کانگریس کے قومی پروگرام کی چند دفعات،

اس کے بعد اب اس فلسفہ پر غور کیجئے جو اس سارے پروگرام میں رہنمائی کر رہا ہے۔ گاندھی جی کا نظریہ حیات سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ تعلیمی اسکیمیں اسی بنیاد پر بنائی گئیں، چرخہ، اہنسا، بھجناولی، ستیاگرہ، اوپاس، خموشی کا دن، اور ہریجن اودہار، اس نئے مذہب اور ہندوستان کی سیاسی تحریکات کے بنیادی اصول قرار پائے، گاندھی نام ہے کانگریس کا، اور اُنکے خاص نظریۂ حیات کا نام ہے کانگریسی پروگرام، یہ دونوں

ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔

یہ خاص نظریہ حیات جبراً لوگوں کے سر چپکایا گیا، نہ صرف عدم تشدد کے ذریعہ بلکہ نہایت بیرحمی اور تشدد کے ذریعہ بھی، حتیٰ بنگال ریگولیشن کے انطباق کے ذریعہ، اس بیرحمی سے گولیوں کی بوچھار، تخویف اور جبر بھی خارج نہیں ہیں، ہندوؤں کی حرکات کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی اور مسلمانوں کے ساتھ ایک ناقابل توجہ اقلیت کا سلوک کیا گیا۔

عدم توجہی پھر بھی غور کردہ قتل عام سے کمتر درجہ کا جرم ہے، کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر جس طرح مظالم کئے گئے ان کی داستان اس قدر لرزہ خیز ہیں کہ تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے سوا کوئی دوسری نظیر شاید نہ مل سکے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ انگریز غیر ملکی اور اجنبی تھے اور کانگریسی قوم پرستی کے مدعی، ہر شخص اپنے دل میں صوبہ جاتی خود مختاری میں حصہ دار بننے کی بجائے قبل از اصلاحات زمانہ کی طرف لوٹ جانے کیلئے بے چین تھا۔ اس سوراج کا کیا فائدہ جس کا افتتاح اور جس کی تعمیل برطانوی سنگینوں کے بل سے ہوئی ہو۔ کانگریس کی صداقت تو جب ہوتی کہ وہ برطانوی اسلحہ سے بے نیاز ہو کر اپنی شہنشاہیت کی بنیاد لوگوں کی خیر سگالی اور رضاکارانہ تعاون پر رکھتی، لیکن کانگریس نے اس کے برخلاف مطلق العنانی اور آمریت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور مخالفوں کے ساتھ انتقام اور غصہ کے جذبات کے ماتحت سلوک کیا۔ کانگریس نے اپنا سوراج کی عمارت نام نہاد اقلیتوں کے ویرانہ پر تعمیر

کرنے کی سعی کر کے ہٹلر کی قدم بہ قدم پیروی کی۔ بہر حال کانگریس نے ایک خواب دکھایا۔ اور لوگ حیران ہیں کہ اسے کسی پارسا کا اثر سمجھیں یا شیطان کا کرشمہ۔

ہندوستان کی مزعومہ وحدت

تاریخ کے آئینہ میں

آل انڈیا مسلم لیگ لاہور کی تجویز جیسے ہی شائع ہوئی۔ ہندوستان کے طول وعرض میں مخالفین نے ایک طوفان اٹھایا کہ ہندوستان ہمیشہ سے ایک ہے۔ ہر دور میں ایک تھا، ہندو راج میں ایک تھا، مسلم بادشاہت میں ایک تھا۔ اب اس کو تقسیم کیسے کیا جاسکتا ہے، ہندوستان کی تاریخ ہر مدرسہ میں درس میں داخل ہے، چھوٹی بڑی سیکڑوں تاریخیں بازار میں بک رہی ہیں۔ ہر لائبریری میں بیسوں نسخے ہندوں مسلمانوں اور انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے موجود ہیں۔ بھلا اس صورت میں کون ایسی مہمل اور خلاف حقیقت بات کو تسلیم کرے گا۔ چاہئے اس مہمل نوائی کا مرتکب کوئی بڑا سے بڑا لیڈر ہو یا کوئی فاضل ترین پروفیسر۔

پھر بھی ناظرین کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہم جزیرہ نمائے ہند کی پچھلی تاریخ کی طرف نہایت اختصار کے ساتھ اشارے کئے دیتے ہیں انھیں آپ ایک یادداشت سمجھیں جس کی مدد سے آپ کے حافظہ میں

وہ تمام نقوش ابھر آئیں گے جو تاریخوں کے مطالعہ سے مرتسم ہیں۔ یا پھر ایک ایسا چراغ تصور فرمائیے جس کی روشنی سے وہ سیاہی نابود ہو جائیگی جو وہ رہا۔ مدراس اور لکھنؤ کے بیانات نے فضا میں پھیلائی ہے

موجودہ ہند اس وقت ہندوستان کا اسم جس مسمی کے لئے بولا جاتا ہے۔ وہ تقریباً (۱۸۰۸۶۷۹) مربع میل رقبہ کا ایک وسیع جزیرہ نما ہے جس کے حدود حسب ذیل ہیں۔

شمال کوہ ہمالیہ، چینی ترکستان

جنوب خلیج بنگال، اور بحیرۂ ہند

مغرب بحیرہ عرب، ایران وافغانستان

مشرق برما وسیام

یہ حدود درحقیقت انگریزی فتوحات کے حدود ہیں کسی ملک کے حدود نہیں ہیں۔ جہاں تک انگریزی فوجیں بڑھ کر فتح کرلیتی تھیں، اس کو وہ اپنے مرکز سے جوڑ دیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب برما فتح ہوگیا تو لارڈ ڈلہوزی نے اسے بھی اپنے کلکتہ کے مرکز سے ملحق کردیا۔ اسی طرح جب افغانستان ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو کابل بھی ہندوستان کا جزء بنادیا گیا۔ لیکن ۱۸۴۱ء میں افغانوں نے انگریزوں کو مار بھگا دیا تو افغانستان الگ ہوگیا۔ اسی طرح ۱۸۴۲ء میں افغانستان کے

خلاف کارروائیوں کے سلسلہ میں جب انگریزی فوجوں کا سندھ پر کامل قبضہ ہو گیا تو سندھ کو بھی کلکتہ سے ملحق کر دیا گیا۔

غرض کہ انگریزی فتوحات کا سیلاب بڑھتے بڑھتے جس نقطہ پر ٹھہر گیا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ٹھہرا دیا گیا ہے وہ آج ہندوستان کہلاتا ہے، ہر دو چار سال کے بعد انگریز شمالی مغربی سرحدیں کچھ نہ کچھ بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جہاں یونین جیک لہرانے لگتا ہے وہ علاقہ ہندوستان کی "پوتر بھومی" بن جاتا ہے

جغرافیائی اختلافات تاریخی واقعات سے پہلے ذرا موجودہ بلہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا جغرافیائی مقابلہ فرمائیے اور اس کے بعد اپنے اُن دوستوں کی دانائی پر سر دھنئے جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک ہے۔

سندھ کی آب وہوا۔ بول چال، غذا، اور لباس کا مقابلہ کیجئے بہار خصوصاً ضلع مانبھوم اور پورلیلیا وغیرہ کی عام زندگی سے، اسی طرح بلوچستان کی آب وہوا، غذا، لباس، اور زبان کا مقابلہ فرمائیے کرناٹک اور تلنگانہ کی آب وہوا بول چال، اور زبان و غذا سے، اور اضلاع ہرائچ گونڈہ اور ٹبول بازار کے علاقوں کو ملتان، ڈیرہ اسماعیل خاں اور سیالکوٹ سے ملائیے، اس وقت آپ پر اچھی طرح روشن ہو جائیگا

کہ ہندوستان ایک ملک ہے یا چند ممالک پر مشتمل ایک جزیرہ نما ر۔
رہا یہ خیال کہ تین طرف سمندروں اور ایک طرف پہاڑ سے محدود
ہونے کی بناء پر اسے ایک ملک سمجھنا چاہیئے جیسا کہ راجن بابو نے
اپنی کتاب پاکستان میں لکھا ہے۔ تو شاید اس اصول پر ست پڑا کی
پہاڑیاں جنوبی ہندوستان کو بھی نہایت غیر مشتبہ طور پر شمالی ہند
سے علیحدہ کر دیتی ہیں۔ یا پھر دوسری طرف یورپ و آفریقہ کے براعظم کی
بھی ایک ہی ملک قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ بھی تین طرف سمندر
اور ایک طرف پہاڑ سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور امریکہ کے ایک
ملک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو چاروں طرف
سمندر سے گھرا ہوا ہے، سارا براعظم ایشیا بھی تین طرف سمندرون
اور ایک طرف سلسلہ کوہ سے محدود ہے۔

غلامی کا اشتراک

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اتنے جغرافیائی اختلافات موجود ہیں جتنے شاید یورپ کے
دو ممالک میں بھی موجود نہ ہوں گے۔ ان حالات میں پورے ہندوستان
میں اگر کوئی مشترک چیز موجود ہے تو صرف انگریزوں کی غلامی جس میں
شاید اسٹریلیا اور کینیڈا بھی بڑی حد تک آپ کے شریک ہیں۔ اب جبکہ
ہندوستان آزاد ہونا چاہتا ہے تو اسی غلامی کی بنیاد پر اسے ایک

ملک کہنا مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک بڑے دانا آدمی نے یہ فرمایا کہ ہندوستان کے کسی حصہ کا رہنے والا ہو امریکہ میں "انڈین" یعنی ہندوستانی کہلاتا ہے اس لئے ہندوستان ایک ملک ہے۔ انھیں یاد نہیں رہا کہ ہندوستان میں بھی امریکہ کے کسی حصہ کا آدمی ہو "امریکن" یعنے امریکہ والا کہلائیگا حالانکہ امریکہ ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم ہے۔

اب ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر ڈھونڈئیے کہ ہندوستان

ہندو عہد کا یہ وسیع براعظم ایک مرکزی حکومت کے ماتحت کب اور کتنے دلون کے لئے رہا ہے، اس مقصد کیلئے سب سے پہلے ہندو عہد کو لیجئے۔ یہ عہد آریون کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت کی جو تاریخ قصہ کہانیوں کی شکل میں ملتی ہے وہ بتاتی ہے کہ ہندوستان میں اُس وقت کئی آزاد حکومتین موجود تھیں۔ دھرم شاستر میں منوجی نے جو چند نام لکھے ہیں اور دوسری روایات سے جو پتہ چلتا ہے اُن میں حسب ذیل حکومتین قابل ذکر ہیں۔

برہم ورت۔ کوروکشتر پنچال، کوسں، آریاورت

یہ پانچ آزاد حکومتین بندھیاچل سے اوپر والے علاقہ میں تھین اور بندھیاچل سے نیچے کا حصہ یعنی دکن تو اس میں شاید ڈراوڈین

سلطنت رہی ہوگی - آرین کہانیوں میں کہیں اس حصہ کا ذکر نہیں ملتا اس کے بعد کے زمانوں میں، مگدھ کی حکومت - کاشی کی حکومت لچھویوں کی سلطنت، اور چند دیگر آزاد حکومتوں کا پتہ چلتا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ صرف شمالی ہند بھی کبھی کسی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت نہ رہا -

اس کے بعد ۵۲۱ سنہ اور ۴۸۵ سنہ ق - م کے مابین یہ ہوتا ہے کہ پنجاب اور سندھ ایرانی حکومت کے صوبے بن جاتے ہیں ۳۲۶ سنہ ق م میں سکندر نے جب ایران سے فارغ ہو کر ہندوستان پر حملہ کیا ہے اس وقت ہندوستان حسب ذیل آزاد حکومتوں پر منقسم تھا -

(۱) ٹیکسلا (۲) مگدھ - (۳) قنوج (۴) کاشی (۵) پورس راج اور جنوبی ہند میں ان کے علاوہ غالباً تین یا چار آزاد حکومتیں موجود تھیں - یونانی مورخوں نے تو اور بھی بہت سی حکومتوں کا ذکر کیا ہے لیکن ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں -

اس کے بعد موریا بنسی راجاؤں کا دور شروع ہوتا ہے - جو غالباً قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی سلطنت کے مالک تھے - لیکن ان کے انتہائی عروج میں بھی پورا جزیرہ نما ایک سلطنت کے ماتحت نظر نہیں آتا جنوب میں چیرا خاندان، پانڈیا خاندان، اور ستیا پترا، کی حکومتوں کے علاوہ

شمال مشرق اور کشمیر کے علاقوں میں آزاد حکومتوں کے نام ملتے ہیں۔

اس کے بعد اندھرا کلنگ (بنگال) کی سلطنتوں اور پنجاب میں نیم یونانی بادشاہوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے جنھیں تاریخ قدیم میں "یون" کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ہندوستان کئی حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

اگرچہ کوئی صحیح تاریخ موجود نہیں ہے۔ نہ لکھی لکھائی اور نہ سنی سنائی۔ لیکن جو کچھ آثار، قصے اور کہانیوں سے گپت، ہرش اور ہون خاندانوں کی حکومت کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ خاندان یکے بعد دیگرے ۳۲۰ء سے ۶۰۰ء تک حکمران تھے، اس وقت بھی سلطنت کے انتہائی عروج کے باوجود ہندوستان ایک نہیں ہوتا۔

بنگال میں الگ سلطنت ہے، اور دکن میں الگ اور ہندوستان خاص یعنی دوآبہ گنگا میں ایک الگ حکومت موجود ہے۔ اور سب ایک دوسرے سے آزاد بلکہ متخاصم ہیں۔ اس چار سو سال میں ایک دن کے لئے بھی یہ جزیرہ نما ایک فرمان روا کے ماتحت نظر نہیں آتا۔

اس کے بعد مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آتا ہے۔ اور ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم ثقفی سندھ میں داخل ہوتا ہے اس وقت ہندوستان کم و بیش ۱۶ آزاد ریاستوں پر منقسم تھا۔ جن کے نام اور تفصیل آپ کو ہندوستان کی کسی بڑی تاریخ میں مل سکتی ہیں۔

ہم اس جگہ ہندو عہد کو ختم کرتے ہوئے حیران ہیں کہ "پراچین بھارت کی وحدت و مرکزیت کا گیت گانے والون کو کیا کہیں، یا پھر کس طرح یقین کر لین کہ ہندوستان ایک وحدت ہے جو ناقابل تقسیم ہے

مسلم عہد محمد بن قاسم کی فتح سندھ (سنہ ۷۱۲ء) سے جزیرہ نمائے ہند کا اسلامی دور شروع ہوتا ہے، راجہ داہر کی حکومت سندھ میں تھی۔ اس کی فتح کے بعد مسلمانون نے آگے قدم نہیں بڑھایا۔ اس طرح سندھ عراق کا ایک جز، اور دمشق کی عظیم الشان مسلم حکومت کا ایک صوبہ بن گیا۔ عباسیون کے ابتدائی دور تک سندھ، بلوچستان اور پنجاب کا بالائی حصہ دمشق اور اس کے بعد بغداد کے صوبے بنے رہے، اس زمانہ کے بہت سے سندھی علماء کا تذکرہ عربی کی پرانی تاریخون میں ملتا ہے۔

عباسیون کی سلطنت پر جب زوال کے آثار نمودار ہوئے تو جیسے اور دوسرے صوبون میں خود مختار حکومتین پیدا ہو گئیں۔ سندھ مین بھی دو چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستین وجود میں آئین۔ ان میں سے ایک کا صدر مقام منصورہ اور دوسرے کا موجودہ شہر ملتان تھا۔ ان کے علاوہ جزیرہ نمائے ہند کے دوسرے حصو نمین سات آزاد حکومتین موجود تھیں جن میں بنگال قنوج، دہلی اور کالنجر کے راجہ بہت مشہور ہیں یہ حکومتین

بالکل آزاد اور ایک دوسرے سے غیر متعلق تھیں۔

غزنوی خاندان کے بانی سبکتگین نے پنجاب کے راجہ جے پال کو اپنے زیر نگین کر لیا۔ اس وقت پنجاب غزنی کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا "ہندوستان خاص"، یعنی دوآبہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جے پال بد عہدی کی اس لئے کچھ ہی دنوں کے بعد سبکتگین نے اُسے نکال کر پنجاب کو سلطنت غزنویہ میں شامل کر لیا۔

اس وقت سے ۱۱۹۴ء تک جب کہ سلطان شہاب الدین غوری نے پرتھی راج کے مقابلہ میں فتح حاصل کر کے "ہندوستان خاص" میں سلطنت قایم کی۔ کسی وقت بھی ہندوستان ایک نظر نہیں آتا۔ مختلف حصوں میں آزاد حکومتیں دکھائی دیتی ہیں جن کے مابین کبھی جنگ اور کبھی صلح رہتی ہے۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے وقت ہندوستان کا نقشہ یہ ہے کہ سطح مرتفع دکن میں تین آزاد حکومتیں ہیں۔ اضلاع بہرائچ۔ گونڈہ، اور بستی میں پہاڑی ہندو سردار آزاد حکمرانی کر رہے ہیں۔ بنگال، بہار یو پی، پنجاب اور سندھ پر غوری حکومت ہے، اڑیسہ اور اندھرا میں ایک علیحدہ راج قایم ہے، سلطان کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ کی نئی سلطنت سندھ میں قایم ہو جاتی ہے، غزنی سے ہندوستان کا

کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور قطب الدین ایبک کی شہنشاہی میں پنجاب، یوپی بہار، اور بنگال یہ چار صوبے ایک بن جاتے ہیں باقی علاقے بدستور آزاد ہیں۔

اس کے بعد شمس الدین التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن اور معز الدین کیقباد کے عہد تک تقریباً وہی حالت رہی جو سلطان محمد غوری کی وفات کے وقت تھی بلکہ بنگالہ میں ایک اور آزاد سلطنت قائم ہو گئی۔

اس کے بعد خلجیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ علاءالدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا۔ راستہ میں دشمنوں کی آزاد حکومتیں موجود تھیں۔ لیکن علاءالدین ان سب سے بچتا ہوا یہاں آ پہنچا اور کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی صرف دیوگری تک تھی۔ اس نے بعد کو اپنے سپہ سالار کافور کو بھیجکر راس کماری تک فتح کر لیا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ جنوبی ہند دہلی کے ماتحت ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۱۲ء کا ہے، علاءالدین کی وفات کے وقت اس کی سلطنت میں صوبہ آسام، صوبہ سرحد، اور قسمت بھاگلپور۔ ضلع بہرائچ گونڈہ وبستی اور راجپوتانہ کے چند آزاد راجاؤں کو چھوڑ کر وہ تمام حصے شامل تھے جو آج برطانوی ہند کہلاتے ہیں۔

اگرچہ اس وقت بھی سارا ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت

نہیں ہوا تھا بلکہ بہت سے اجزا خود مختار موجود تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عالمگیر کے عہد تک پھر کبھی ہندوستان کا اتنا بڑا حصہ بھی کسی ایک بادشاہ کے زیر نگمن نہ آسکا۔

خلجیوں کے بعد تغلقوں کا دور شروع ہوتا ہے، ان کے زمانہ میں بغاوتیں بہوت پڑیں، اور علاقے آزاد خود مختار ہونے لگے۔ اس زمانہ میں دکن کا حصہ الگ حکومت بن گیا۔ بیس سال تک جنوبی ہند کا کچھ حصہ دہلی کے ماتحت رہ سکا تھا۔ کہ حسن گنگو بہمنی نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ ادھر وجیانگر میں ایک آزاد حکومت بن گئی۔

سادات کا زمانہ ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک رہا اس زمانہ میں ہندوستان گیارہ آزاد سلطنتوں میں منقسم تھا۔

لودیوں کے زمانہ میں بھی یہی حالت قایم رہی۔ ۱۵۲۶ء میں جب کہ بابر کے مقابلہ میں ابراہیم لودی لڑتا ہوا مارا جاتا ہے۔ ہندوستان میں لودی سلطان کے علاوہ حسب ذیل آزاد فرمان روا موجود تھے۔

بنگال میں نصرت شاہ، گجرات یعنی بندھیاچل سے سومنات و سورت تک، مظفر شاہ گجراتی، میواڑ میں رانا، راجپوتانہ میں راجپوت سردار، بیدر میں برید شاہ، بیجاپور میں عادل شاہ، احمدنگر میں نظام شاہ، وجیانگر میں راجہ وجیانگر، پنجاب میں دولت خاں، ایلچ پور میں احمد شاہ،

گولکنڈہ میں قطب شاہ، برار میں عماد شاہ، سندھ میں یوسف شاہ ملتان میں لنگاہ

یہ سلطنتیں ایک دوسرے سے بالکل آزاد تھیں، نہ کوئی کسی کا باج گزار

تھا، اور نہ کوئی کسی کا ماتحت، نہ کوئی مرکزی حکومت تھی، اور نہ کسی قسم کا وفاق

مغل دور حکومت میں ہمایوں کا ابتدائی زمانہ بہادر شاہ گجراتی سے لڑنے

اور گجرات و مالوہ کو فتح کرنے میں بسر ہوا، بنگال میں نصرت شاہ کو خود باربرنے

معاہدہ کے ذریعہ آزاد فرمان روا تسلیم کر لیا تھا، دکن کی حکومتیں بدستور

قایم تھیں، اور عالمگیر کے آخر زمانہ تک قایم رہیں۔ سوریوں کا زمانہ اسی طرح

ختم ہوا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں آزاد بادشاہ حکمرانی کرتے رہے

ہمایوں کا دوسرا دور اور شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں مالوہ اور دکن کے خلاف مہمیں

روانہ ہوئیں، مالوہ اور گجرات تو اکبر کی فوجوں نے دہلی سے ملحق کر لیا، مگر دکن

میں ایسی کامیابی نہ ہو سکی۔ اکبر نے اپنی وفات سے پہلے بنگالہ اور کشمیر کی فتح

سے ہندوستان کے بڑے حصے کو سلطنت دہلی کے زیر نگین کر دیا تھا، مگر گولکنڈہ

اور بیجاپور کی آزاد سلطنتیں اب بھی موجود تھیں، ان کے علاوہ آسام میں مغلوں

کا قدم ابھی نہیں پہنچا تھا۔ بہر حال اکبر کے انتقال کے وقت حسب ذیل ۱۵ صوبے

اس کی سلطنت میں شامل تھے،

(۱) کابل (۲) قندہار (۳) سندھ (۴) ملتان (۵) لاہور (۶) کشمیر (۷)

دہلی (۸) آگرہ (۹) اجمیر (۱۰) الہ آباد (۱۱) اودھ (۱۲) بہار (۱۳) بنگال (۱۴) اڑیسہ۔

(۱۵) گجرات (۱۶) مالوہ (۱۷) خاندیس (۱۸) برار (۱۹) احمد نگر۔

اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بعد شاہ جہان کے عہد میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہوئی، داخلی فتنہ اٹھتے اور دبائے جاتے رہے، البتہ نظام شاہی سلطنت کا الحاق شاہ جہانی عہد کا ایک قابل ذکر واقعہ ہے، مگر چونکہ اس خاتمہ اور الحاق کی تکمیل عالمگیری دور میں ہوئی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت کے حدود میں تبدیلی عالمگیری دور کا واقعہ ہے۔

عالمگیر نے اپنی تلوار کی قوت سے نہ صرف جزیرہ نمائے ہند کے پورے حصہ کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا بلکہ افغانستان اور آسام کو بھی دہلی سے ملا دیا، عالمگیری دور میں غالباً سب سے پہلی بار آسام ہندوستان کا ایک جزء قرار پاتا ہے، دکن کی حکومتیں ایک ایک کر کے ختم کر دی گئیں، جو باقی رہ گئی تھیں وہ یا تو باج گزار تھیں یا شاہی نگرانی کے ماتحت تھیں، لیکن یہ حدود کسی ملک کے حدود نہ تھے، بلکہ فتوحات عالمگیری کے حدود تھے جن میں بلخ اور قندہار کے قرب وجوار اور کابل کا صوبہ بھی داخل تھا۔

اس قسم کے موقتی حدود مرکز کی ذراسی کمزوری سے بدل جاتے ہیں، چنانچہ یہی ہوا، عالمگیر کی وفات کے بعد یعنی مرکزیت قایم ہونے کی صرف دس بارہ سال کے اندر یہ وحدت و مرکزیت پارہ پارہ ہو گئی۔ مختلف علاقے آزاد ہو گئے۔ دکن میں آزاد ریاستوں کی بنیاد پڑ گئی۔ راجپوتانہ کے سردار آزاد ہو گئے

مرہٹوں نے سر اٹھایا۔ غرض یہ کہ اس وسیع جزیرہ نما کا کسی ایک مرکز کے ماتحت رہنا ناممکن ہے، ناممکن تھا، اور ناممکن ثابت ہوا۔

انگریزوں نے بنگال میں قدم جمائے، مدراس پر قبضہ قایم تھا، سنہ ۱۸۴۰ء میں کشمیر، سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب، سنہ ۱۸۴۳ء میں سندھ۔ سنہ ۱۸۴۸ء ستارا، سنہ ۱۸۵۳ء میں برار، سنہ ۱۸۵۲ء میں ناگپور اور سنہ ۱۸۵۷ء میں اودھ۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں دہلی سنہ ۱۸۶۲ء میں شمالی و مغربی سرحد کے علاقوں پر قبضہ جمایا۔ اور ان سب کو اپنے مرکز کلکتہ کے ماتحت کر دیا۔ اس کے بعد جب دہلی میں صدر دفتر منتقل کیا گیا تو یہ سب علاقے دہلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت آ گئے۔

یہ ہے ہندوستان کی مزعومہ وحدت کا صحیح خد و خال تاریخ کے آئینہ میں۔ اگر اس کے بعد بھی کسی کی سمجھ میں یہی آئے کہ ہندوستان ہمیشہ سے ایک رہا ہے اور ایک ہی رہے گا تو پھر ؎

اُس بت سے خدا سمجھے

محمد اقبال سلیم گاہندری

تجاویز

غالباً پچھلے صفحات کے مطالعہ سے آپ پر یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا کہ ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت کا قیام ہندوؤں، مسلمانوں، اور اچھوتوں میں سے کسی کے لئے بھی امن و چین کی زندگی بسر کرنے اور اپنے اپنے اجتماعی تصورات کے مطابق بغیر رکاوٹ پیدا ہوئے ترقی کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ اگرچہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرکز میں ہندوؤں کی زبردست اکثریت ہونے کی بنا پر یہ اُن کے لئے مفید ہو گا۔ اور شاید یہی تصور ہے جو عام طور پر ہندوؤں کو تجویز لاہور کی مخالفت پر آمادہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن ذرا عمیق نظر سے دیکھنے والے کو صاف نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اور اُن کے خصوصی تصورات زندگی، مرکزی حکومت کی مقرر کردہ پالیسی سے بار بار ٹکراتے رہیں گے، ممکن ہے کہ ہمارے ہندو بھائی کسی جادو کے ڈنڈے یا نشہ آور دوا کے ذریعہ کروڑوں انسانوں کی اس آبادی کو جو اپنے علاقوں میں بعض جگہ ۹۶ فیصد تک اکثریت رکھتی ہے اور جن

کے رسوم احکام مذہب اور تصورات دوسرے علاقوں کی اکثریت سے بالکل مختلف ہیں اپنے کو مرکز کی غلامی میں دیدینے پر راضی کر لینے کا خیال رکھتے ہوں، لیکن حقیقت بین آنکھوں کو تو صاف نظر آرہا ہے کہ پہلے فوجی قوت سے ان کو کچل کر خاص نظام تعلیم کے ذریعہ اُن کو ہندو دھرم میں جذب اگر نہ کر لیا جائے، تو ہندوستان کی مرکزی حکومت اُن سے اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی نہیں کرا سکتی، اب تک انگریزی حکومت نے مشرقی بنگال" اور سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ تقریباً یہی برتاؤ رکھا ہے مشرق کے مسلمانوں کو معاشی اور تعلیمی حیثیت سے انتہائی پست کر دیا گیا ہے اور شمال و مغرب کے مسلمانوں پر اس کے علاوہ سخت قسم کا فوجی پہرہ بھی قایم ہے. اگر ہندوستان میں ایک ہی مرکزی حکومت کے ماتحت حکمرانی کی گئی تو آیندہ بھی یہی طریقہ عمل جاری رکھنا پڑیگا، جو نہ صرف مسلمانوں پر ظلم ہوگا، بلکہ بڑھتے ہوئے احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے بہت دن تک اس نظم کا قایم رہنا بھی ممکن نظر نہیں آتا۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح فکر و بصیرت رکھنے والوں نے مختلف تجاویز مرتب کی ہیں۔ جن میں تفصیل کیساتھ ہندوستان کے آیندہ انتظام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام تجاویز مسلم لیگ کی اس ذیلی کمیٹی کے سامنے ہیں جو خاص اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ مسلم لیگ نے ابھی

تک نہ تو خود کوئی تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے، اور نہ پیش شدہ تجاویز میں سے کسی کو منظوری کا شرف بخشا ہے، یہ طریقہ عمل بالکل اصولی ہے، سب سے پہلے ہندوں اور برطانیہ دونوں سے یہ تسلیم کرانا ضروری ہے کہ ہندوستان میں مسلم صوبے اور ہندو علاقے کسی ایک مرکز کے ماتحت رہ کر ترقی نہیں کر سکتے رہا یہ مسئلہ کہ دو یا دو سے زیادہ مرکزی حکومتیں قایم ہوں تو اُن کے باہمی تعلقات کیا ہونگے۔ اُن میں کون کون سے علاقے شامل ہونگے۔ اور خود اُن علاقوں میں باہمی تعلقات کس طرح کے ہوں گے۔ مسلم لیگ کیلئے ضروری نہیں کہ اسی مرحلہ پر اس کا حل پیش کرے۔ یہ فروع ہیں جن پر آج ہی غور کیا جا سکتا ہے اور کل بھی۔

ماضی کا تجربہ ہندوستان کے مختلف حصے آپس میں جغرافیائی اختلافات بھی اس قدر رکھتے ہیں کہ شاید فرانس وجرمنی کے مابین اس سے زیادہ اختلافات نہ ہوں گے مزید براں چھ سو سے زیادہ چھوٹی بڑی ریاستیں موجود ہیں جن کا موجودہ مرکزی حکومت سے کوئی آئینی تعلق نہیں ہے اور نہ ان میں مرکز کا بنایا ہوا قانون جاری ہوتا ہے، حد تو یہ ہے کہ کاشتکاری و زمینداری کے متعلق ایک قسم کا قانون دو صوبوں میں نہیں چل سکتا۔ بنگال کے خصوصی حالات جس قسم کے قوانین کا مطالبہ کرتے ہیں شاید اس قسم کا قانون مدراس میں ایک دن کے لئے بھی کامیابی کیساتھ نافذ نہیں

کیا جاسکتا۔ سوائے حکومت برطانیہ کی غلامی کے جس میں سنگاپور، اور تاج کے دوسرے دور افتادہ مقبوضات بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کوئی ایسی اہم چیز مشترک نہیں جو ان سب کے لئے ایک مرکز کے ماتحت رہنے کو مفید بنا سکے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریز مجبوراً حکومتی ضرورت کے لئے۔ اس جزیرہ نما، کو وقتاً فوقتاً تقسیم کرتے رہے اس طرح نئے نئے صوبہ جات بن رہے ہیں۔ اُن کو دستور سازی کا حق دیا جا رہا ہے۔ آج سے چار پانچ سال پہلے تک برما ہندوستان کا جزو تھا۔ تجربہ نے بتایا کہ اس طرح نظم درست نہیں رہتا برما والوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے، علیحدہ کر دیا گیا۔ عدن گورنر بمبئی کے ماتحت تھا، اب الگ ہے۔ سندھ بمبئی کا جزو تھا۔ الگ کرنا پڑا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے معلوم ہو جائیگا کہ راس کماری سے ننگا پربت اور کاٹھیا واڑ سے آسام تک کی ایک اور بالکل ایک حکومت قائم رکھنے کی نامحمود مساعی نے کیا کیا الجھنیں پیدا کی ہیں۔ یہاں تک کہ سائمن کمیشن کو اپنی رپورٹ میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندوں کے مابین کوئی مشترک تصور حیات موجود نہیں ہے بلکہ شمالی مغربی علاقہ کو مدراس و ممالک متوسط سے بھی مکمل طور پر متحد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہیں ماضی کے تجربات، اور یہ ہیں موجودہ حقائق جن کی روشنی میں زیر نظر تجاویز اہل فکر حضرات نے

مرتب کی ہیں۔ ہم انھیں اختصار کے ساتھ اس جگہ درج کرتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ سر سکندر حیات خاں کی اسکیم بھی درج کر دیتے ہیں جو دو مرکزی حکومت کے تصور پر مبنی تو نہیں ہے لیکن بہر حال اسی سلسلہ کی ایک تجویز ہے۔

تجویز علی گڑھ

یہ تجویز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دو فاضل اساتذہ سید ظفر الحسن اور محمد افضل حسین قادری صاحبان کے افکار کا نتیجہ ہے لایق اساتذہ نے اپنی تجویز کی بنیاد حسب ذیل اصول پر رکھی ہے۔

(۱) ہندوستانی مسلمان کسی موہوم ہندوستانی قومیت کا جز نہیں بلکہ اپنی جگہ پر خود ایک قوم ہیں، ان کی قومی وحدت ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم جماعتوں سے بالکلیہ مختلف بنیادون پر قایم ہے سودتین جرمنون اور چیکون کے مابین جو اختلافات ہیں اُن سے کہین زیادہ ہندون اور مسلمانون کے مابین فرق موجود ہے۔

(۲) مسلمانون کا قومی مستقبل دوسرون سے بالکل علیحدہ ہے۔ اس طرح دنیا کی بہتری میں ان کو ایک الگ فریضہ انجام دینا ہے

(۳) مسلم ہندوستان کے مستقبل کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ ہندوں

انگریزوں، یا کسی دوسری جماعت کے معاشی دستبرد سے بالکلیہ آزاد ہو

(۴) وہ صوبے جن میں مسلمان اکثریت رکھتے ہیں، ایک ایسے کل ہند وفاق کے غلام نہیں بنائے جا سکتے جس میں ہندوؤں کی زبردست اکثریت کا ہونا لازمی ہے۔

(۵) اُن صوبوں کے مسلمان جہاں ان کی آبادی کم ہے، مذہبی ثقافتی اور سیاسی انفرادیت سے بالکل محروم نہیں کئے جا سکتے اس لئے ان کو مسلم صوبوں کی طرف سے موثر امداد ملنی چاہئے۔

اس تجویز میں موجودہ ہندوستان کو چند خود مختار حکومتوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔

۱۔ **پاکستان** اس میں، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان ریاست ہائے کشمیر و جموں، منڈی، چمبہ، سکیت، سیمن، کپور تھلہ۔ مالیر کوٹلہ، چترال، دیر، قلات، لوہارو، کوہسار شملہ کی ریاستیں، اور ریاست بھاولپور وغیرہ شریک ہونگی۔

مجموعی آبادی:- ۴۴۲،۴۰،۲۹۲،۳

مسلمان:- ۲/۳۶/۹۷/۵۳۸

مسلم آبادی فیصد:- ۶۰،۳

۲۔ **بنگال** (باستثنائے اضلاع ہوڑہ مدنا پور) اس میں بہار کا ضلع

پورنیہ، اور آسام کا ضلع سلہٹ بھی شامل ہوگا۔

مجموعی آبادی :- ۵،۲۵،۷۹،۲۳۲

مسلمان :- ۳ ،۰۱،۱۸،۱۸۴

مسلم آبادی :- فیصد ۵۷

۳۔ ہندوستان باستثنائے پاکستان، بنگال دولت آصفیہ حیدرآباد

مجموعی آبادی :- ۲۱،۶،۰۰،۰۰،۰۰۰

مسلمان :- ۲،۰۹،۶۰،۰۰۰

مسلم آبادی فیصد :- ۹،۷

۴۔ حیدرآباد اس میں حیدرآباد، برار، اور علاقہ کرناٹک شریک ہوں گے۔

مجموعی آبادی :- ۲،۹۰،۶۵،۰۹۸

مسلمان :- ۲۱،۴۴،۰۱۰

مسلم آبادی فیصد :- ۷،۴

(الف) دہلی اس میں دہلی، میرٹھ، روہیلکھنڈ۔ ضلع علیگڑھ وغیرہ شریک ہوں گے۔

مجموعی آبادی :- ۱،۲۶،۶۰،۰۰۰

مسلمان :- ۳۵،۲۰،۰۰۰

مسلم آبادی فیصد :- ۲۸

(ب) مالابار

مالا بار اور ملحقہ حصے شریک ہونگے

مجموعی آبادی :- ۴۹،۰۰،۰۰۰

مسلمان :- ۱۴،۴۰،۰۰۰

مسلم آبادی فیصد :- ۲۷

آزاد شہر اس کے علاوہ ایسے شہر جن کی آبادی پچاس ہزار یا اس سے زیادہ نفوس پر مشتمل ہو۔ "آزاد شہر" کی حیثیت کے مالک ہوں گے جن کو داخلی خودمختاری حاصل ہوگی۔ ایسے شہروں میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً (۱۳،۸۸،۶۹۸) چودہ ہزار ہوگی۔

دیہاتی مسلمان :- ہندوستان کے دیہاتی حصوں میں مسلمانوں کو جو بکھری ہوئی آبادی ہے، انکو ہدایت کی جائے گی کہ وہ ایسے بڑے دیہاتوں اور قصبوں میں جمع ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی موجود ہے۔

حقوق مندرجہ بالا خودمختار حکومتوں میں سے پاکستان اور بنگال مسلمان کے لئے اور ہندوستان ہندوؤں کیلئے قومی وطن کی حیثیت رکھیں گے۔ اور آپس میں امن و جنگ کے متعلق معاہدہ کریں گے

ہندوستان کے مسلمانوں اور پاکستان و بنگال کے ہندون کو جب وہ چاہیں، اپنے اپنے قومی وطن کی طرف ہجرت کرنیکا حق حاصل ہوگا۔ ہندوستان میں جو مسلمان ہون گے۔ انھیں ایک قوم اور پاکستان و بنگال میں بسنے والی مسلمان قوم کا جزء تسلیم کیا جائے گا۔ پاکستان، بنگال اور ہندوستان، تینون حکومتوں میں سکھوں، اچھوتوں، اور دوسری اہم اقلیتوں کو جداگانہ حق انتخاب اور تحفظات عطا کی جائیں گی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک سیاسی ادارہ ان کا نمایندہ ادارہ تسلیم کیا جائے گا۔

ہر سہ حکومتیں حکومت برطانیہ سے الگ الگ معاہدہ کرین گی۔ اور ان تینوں کی ایک مشترک عدالت ان امور کے فیصلہ کے لئے قایم کی جائے گی جو ان حکومتوں کے مابین، یا ان کے اور برطانیہ کے مابین پیدا ہوں

حیدرآباد

حیدرآباد کی حیثیت ایک آزاد بادشاہت کی ہوگی، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ معاہدات کی روشنی میں حیدرآباد ہندوستان کا جزء نہیں بلکہ ایک آزاد سلطنت ہے۔ جو علاقے مختلف وقتوں میں معاہدات کے ذریعہ حکومت برطانیہ کو انتظام کے لئے دیئے گئے ہیں وہ حیدرآباد کو واپس کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد اسے کم از کم اس قدر آزاد تسلیم کر لیا جائے جتنا کہ نیپال کو سمجھا جاتا ہے۔ علاقوں کی واپسی سے اس سلطنت کو بحری راستہ مل جائیگا۔ اور جزیرہ نمائے

ہند کے جنوب میں یہ ایک مضبوط بازو ثابت ہوگی۔

تہذیبی منطقوں کی تجویز

یہہ تجویز ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور بہت غور و خوض کے بعد یہ تجویز مرتب فرمائی ہے جو مسلمانوں اور ہندوں کے لئے تہذیبی منطقوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے "تہذیبی منطقوں کی تجویز" کہلاتی ہے

موجودہ حالات کے ماتحت ہندوستان کے مسلمانوں کو چار یا پنجم تہذیبی منطقوں CULTURAL ZONE میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوں کے لئے کم از کم گیارہ تہذیبی منطقے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور دیسی ریاستوں کے بھی جو سارے ملک میں منتشر ہیں ان کے فطری رجحانات کے مطابق مختلف مذاہبی منطقوں میں تقسیم عمل آسکتی ہے۔ ایسا ہر منطقہ ایک آزاد خود مختار مملکت ہوگا۔ جس کا اندرونی انتظام وفاقی صورت اختیار کرے گا۔ اور اس کو اسی طرح کی دوسری آزاد مملکتوں کے ساتھ ایک کل ہندی وفاق یا اتحاد

میں موزون جگہ حاصل رہیگی۔ پہلے مسلمانون کو لیجئے۔

شمال مغربی حلقہ اس وقت شمال مغرب میں مسلمانون کا ایک بڑا حلقہ ہے جو سندھ، بلوچستان پنجاب، صوبہ سرحدی اور خیرپور اور بھاول پور کی ریاستون پر مشتمل ہے ان چھ علاقوں میں ایک وفاقی تعلق پیدا کر کے اس سارے رقبہ کو ایک واحد خود مختار مملکت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس میں دو کروڑ ۵۰ لاکھ مسلمانوں کو اپنا آزاد وطن مل جائے گا۔

شمال مشرقی حلقہ ہندوستان کے دوسرے سرے پر شمال مشرق میں بنگال اور آسام میں مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ تین کروڑ سے زائد آبادی پر مشتمل ہے جو اپنی ایک خاص سیاسی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کا حلقہ متذکرہ صدر دونون حلقوں کے درمیان مسلمانوں کی آبادی غیر مساوی طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ان دو حلقون میں سے اپنے سے قریب تر حلقہ میں بس سکتے ہیں۔ اور باقی جن کی بڑی تعداد بہار اور صوبہ متحدہ میں آباد ہے اور جن کی آبادی قریب ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ہے انھیں ایک

ایسے حلقہ میں مجتمع کیا جا سکتا ہے جس کی سرحدیں ریاست پٹیالہ کے مشرق سے لکھنؤ تک وسیع ہوں گی۔ اور جس میں رام پور بھی شامل ہو جائیگا

دکن کا حلقہ

بندھیاچل اور ستپوڑہ کے جنوب میں جو مسلمان آباد ہیں ان کا معاملہ خاص طور پر غور و فکر کا مستحق ہے۔ یہ سارے جنوبی ہند میں منتشر ہیں۔ ان کی آبادی کے رقبوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے ورنہ ان کی تعداد کم و بیش ایک کروڑ بیس لاکھ ہے ان کے لئے ایک حلقے کے تراشنے کی ضرورت ہے۔ اور ایسا حلقہ حیدرآباد کی ریاست فراہم کرسکتی ہے۔ اس غرض کے لئے جنوب کی طرف سے ایک خط اراضی جو اضلاع کرنول کڑپہ، چتوڑ۔ شمالی ارکاٹ اور جنگلی پیٹ سے گذر کر شہر مدراس تک پہنچتا ہے۔ حیدرآباد کو واپس دیا جا سکتا ہے ایسا خطہ جس کا راستہ سمندر کی طرف کھلا ہوگا مسلمان تاجروں اور ساحل پر رہنے والوں کی اس بڑی جماعت کو آباد کرنے کے لئے ضروری ہوگا جو صدیوں سے کارومنڈل اور ملیبار پر آباد ہے۔ اس حلقہ کی تشکیل ہر فریق کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اور اس کی بدولت پانچ جداگانہ ہندو اقوام یعنے مرہٹہ۔ کنڑی۔ ملیالی۔ ٹامل اور آندھرا کے لئے کامل آزادانہ وجود کا موقعہ بہم پہونچیگا اور ان کی جداگانہ سرحدیں قایم ہوسکیں گی۔ حیدرآباد کا موجودہ رقبہ لسانی اعتبار سے ایک وحدت نہیں ہے۔ شمالی مغربی اضلاع کی زبان

مرہٹی ہے۔ جنوبی مغربی اضلاع کی کنڑی۔ اور مشرقی اضلاع کی تلنگی زبان ہے ریاست حیدر آباد کی تلنگی بولنے والے باشندے صوبہ اندھرا میں ضم ہوسکتے ہیں۔ جو شمالی سرکار گنٹور۔ نلور پر مشتمل ہوگا۔ اور جس میں کرنول کڑپہ اور جنور کے کچھ حصے اور صوبہ متوسط کا ایک خطہ شامل ہوگا۔

مرہٹے اور کنڑے مغرب اور جنوب مغرب میں اپنی قوموں میں جذب ہو جائینگے۔ جنوبی ہند کے مسلمان جو دکن کے حلقہ میں آجائیں گے ان میں یہ تاریخی شعور پیدا ہو جائیگا۔ کہ وہ اسلامی تہذیب کے وارث ہیں جو یہاں صدیوں سے نشو ونما پاتی اور پھلتی پھولتی رہی ہے۔ اور جو عہد مغلیہ میں جب کہ یہ سارا علاقہ ایک ہی صوبہ میں شامل تھا اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

اس حلقہ کے لئے جو رقبہ قرار دیا گیا ہے وہ ان مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے جو آباد کئے جائیں بظاہر بڑا معلوم ہوگا لیکن یہاں چند خاص امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے ریاست حیدر آباد کے بڑے بڑے علاقے بھی نشو ونما پا سکتے ہیں۔ وہ یا تو صحرائی رقبہ یا پہاڑی اور بنجر علاقے ہیں اور مسلمانوں کو ایک وسیع جزیرہ نما یعنی جنوبی اڑلیسہ صوبہ متوسط صوبہ بمبئی و مدراس اور میسور۔ ٹراونکور اور کوچن سے لاکر یہاں مجتمع کرنا ہے گذشتہ تیس پینتیس سالوں میں ان علاقوں کے مسلمانوں کی آبادی

میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اور ان کی آئندہ وسعت پذیری کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس کے سوا شمال مشرق اور دہلی و لکھنو کے حلقوں کے مسلمان چھوٹے رقبوں میں محدود رہیں گے اور ان حلقوں کی آبادی بڑھے تو اس کو آئندہ دکن کے حلقہ میں بسایا جا سکتا ہے۔ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ چھوٹے چھوٹے فرقے جیسے عیسائی اور صحرائی اقوام اور ہریجنوں کا ایک بڑا طبقہ جو یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہو گیا ہے خاص مراعات کے تحت یہیں رہنا پسند کریگا اور اس رقبہ میں جتنی آبادی ہونی چاہیے اس کی تکمیل کرے گا۔

مسلمانوں کے چھوٹے منطقے مسلمانوں کے لئے یہ چار حلقے بنانے کی تجویز میں ان مسلمانوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا جو راجپوتانہ، گجرات، مالوہ اور مغربی ہند کی دیسی ریاستوں میں رہتے ہیں۔ انھیں بھوپال، ٹونک، جوناگڑھ۔ جاورہ اور دوسری اسلامی ریاستوں میں تبادلۂ آبادی کی بنیاد پر مجتمع کرنا ہو گا۔ اور اجمیر کو بھی جو مسلمانوں کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے ایک محفوظ مرکز قرار دینا ہو گا۔

ہندوؤں کے تہذیبی منطقے اب اس کے بعد باقی ہندوستان گیارہ تہذیبی منطقوں میں منقسم

ہو سکے گا جس سے ہندوؤں کے ہر تہذیبی مفاد کو استقلال حاصل ہو جائے گا۔ اگر مشرق سے شروع کریں تو بنگال کا ایک حصہ موجودہ بہار کے تھوڑے سے ایسے حصہ کے ساتھ جو تہذیبی مناسبت رکھتا ہے بنگالی ہندوؤں کے لئے ایک جداگانہ حلقہ بن جائیگا۔ اوڑیا بولنے والے باشندوں کو ایک عظیم تر اڈریسہ میں مجتمع کیا جا سکتا ہے، دہلی اور لکھنو کے مجوزہ اسلامی حلقہ سے لیکر مغربی بہار تک اور ہمالیہ سے لیکر بندھیاچل تک جو علاقہ پھیلا ہوا ہے وہ وسط ہند کی ریاستوں کیساتھ ایک علیحدہ حلقہ بن جائیگا۔ ہندوؤں کے مقامات مقدسہ ہردوار الہ آباد۔ بنارس۔ اور متھرا وغیرہ سب کے سب اس رقبہ میں آجائیں گے یہ ہندوستان خاص (۳) کا علاقہ ہوگا جہاں آریوں کی بنیادی تہذیب کو مزید نشو ونما کے لئے کامل آزادی حاصل رہے گی اور شاید ایسی ہندی زبان بھی جس میں نئی روح پھونکی جائیگی اس آزادی کو اجاگر کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی۔ راجپوتانہ (۴) کی ریاستیں باہم ملکر ایک اور حلقہ تشکیل دیں گی جو ان کی قدیم زرعی زندگی کی یاد تازہ کرے گا گجرات (۵) کاٹھیاواڑ کی ہندو ریاستوں کے ساتھ ملا کر ایک علیحدہ حلقہ قرار دیا جا سکتا ہے جہاں گجراتی تہذیب خاطر خواہ ترقی کر سکے گی۔ مرہٹہ قوم (۶)، کے لئے جو اپنی نمایاں قومی خصوصیات اور اپنی تہذیب رکھتی ہے

ایک جداگانہ حلقہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ڈراوڑی تہذیبوں کے مجموعہ کے لئے جن سے کنڑی (۷)، اندھرا (۸)، ٹامل (۹) اور ملیالی (۱۰) تہذیبیں مراد ہیں۔ ان کی اپنی بنیادوں پر جداگانہ نشو و نما پانے کی صورت نکالی جا سکے گی۔ شمال مغرب کے مسلم حلقہ میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لئے ایک حلقہ (۱۱) تشکیل دینا ہوگا۔ اس کے متعلق یہ ہو سکتا ہے کہ سندھ کے ہندوؤں کو گجرات اور کاٹھیاواڑ کے حلقہ میں شریک کر دیا جائے۔ پنجاب یا مسلم حلقہ کے ہندوؤں اور سکھوں کے لئے ایک حلقہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں وہ سکھ اور ہندو ریاستیں شامل ہوں گی جو اس وقت پنجاب ایجنسی کے تحت ہیں اور جو تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے کوئی تہذیبی اختلاف نہیں رکھتیں۔ کشمیر کی ہندو ریاست اسی ہندو سکھ حلقہ میں شامل کر لی جائیگی۔ اس ریاست کی آبادی میں مسلمانوں کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہے۔ چند اضلاع میں مسلمان ہی زیادہ آباد ہیں۔ ان کو باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ پنجاب خاص میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور اس کے معاوضہ میں موجودہ پنجاب کے شمال مشرق کا ایک حصہ جس میں وادی کانگڑہ بھی شامل ہوگی مہاراجہ کے حدود اختیار میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے ایک حصہ میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو آباد کرنے کے لئے یہ حلقہ کافی وسیع ہوگا۔

مذکورۂ بالا ہندو اور مسلم حلقہ کی تشکیل سے ہر تہذیبی وحدت کی سیاسی امنگیں اور ہر ایک کے لئے خود اس کا ایک وطن مہیا ہو جائے گا جو اس کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہوگا۔

تبادلۂ آبادی

اس میں شک نہیں کہ تبادلۂ آبادی کا خیال اکثر لوگوں کے دل میں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان جو کسی خاص سرزمین سے وابستہ ہیں پہلے پہل ایک قسم کی بے کلی پیدا کر دیگا۔ لیکن جو فوائد اس سے حاصل ہونگے۔ وہ اس قسم کی بے کلی یا جذبہ کو بالکل بھلا دیں گے اگر ہر فرد کے لئے اس کے لئے وطن میں وہ تمام معاشی اسباب مہیا کرائے جائیں جو اس کے پہلے مقام پر حاصل تھے تو زمین دوستی کے بجائے ایک نیا جذبہ جو کہیں زیادہ بلند اور شریف ہوگا پیدا ہو جائے گا۔ جو اس کے لئے کافی صلہ ایک دوسرے کی خیرسگالی اس مجوزہ تبادلہ آبادی کی محرک ہوگی ورنہ صرف ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی خاطر عمل میں لائی جائیگی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دائمی طور پر یقین دلانے کے لئے بھی وہ اپنی اپنی تہذیبی بنیادوں پر اپنے اپنے وطن میں آزاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان حالات میں ہر شخص کو چاہئے کہ اس زحمت کو جو ایسی منتقلی میں ضمناً پیش آجائے خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور تبادلۂ آبادی کے عمل کو کافی وسیع مدت تک مثلاً دس بیس سال تک

پھیلا کر ایسی زحمت کو کم کر دیا جا سکتا ہے یا در ہے کہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کو ایسی زحمت پیش آئے گی کیونکہ دو حلقوں سے قطع نظر جو شمال کے دونوں گوشوں میں واقع ہیں مسلمان سارے ملک میں منتشر بستیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی اور لکھنو یا دکن کے حلقہ میں ان کو مجتمع کرنے کا مسئلہ یہ ظاہر ہے کہ بڑی قربانیوں کا باعث ہوگا۔ لیکن یہ بہتر ہے کہ ان کی موجودہ نسل ہی مردانہ وار اس آزمائش کا مقابلہ کرے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کام کو اپنی اولاد کے لئے اٹھا رکھے اس وجہ سے کہ پر امن طریقہ پر آبادی کے تبادلہ کا جو موقع ہمیں اس وقت حاصل ہو سکتا ہے وہ بہت ممکن ہے کہ آنے والی نسلوں کو حاصل نہ ہو سکے ہندوؤں کے لئے آبادی کا تبادلہ نسبتاً کمتر فاصلہ تک محدود رہے گا۔ اور وہ اسی قسم کی آب و ہوا کے علاقوں میں منتقل ہو جائینگے۔ اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کے اسلامی حلقہ سے آبادی کا تبادلہ تمام ہندوؤں کے حق میں اس وجہ سے مفید ہوگا کہ یہاں تین مختلف ہندو نسلیں آباد ہیں جو تین مختلف ہندو نسلیں آباد ہیں جو تین مختلف زبانیں یعنی تلنگی۔ کنڑی اور مرہٹی بولتی ہیں اس اسکیم کے تحت وہ ہمسایہ ہندو حلقوں میں جا کر اپنے ہم نسلوں سے مل جائیں گے اور اپنے ہم جنس لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔

تجویز انڈستان

یہ تجویز ایک "پنجابی" کی طرف سے خاصی ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے ناشر جناب نواب سر شاہ نواز خاں صاحب آف ممدوٹ ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے، اور اس کا انگریزی نام "کانفیڈریسی آف انڈیا ہے" لیکن عام طور پر اردو میں اسے "تجویز انڈستان" کہا جاتا ہے۔ اس تجویز کی بنیاد حسب ذیل مسلمات پر ہے۔

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں، اور تصور حیات اس قدر متضاد ہے کہ کسی طرح ان کو ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا اسلامی قومیت کا تصور، ہندو قومیت سے بالکل مختلف ہے۔

(۲) اسلامی دور حکومت میں بھی ہندو اگرچہ حکومت کی طاقت سے دبے ہوئے تھے مگر یہ غلط ہے کہ دونوں قوموں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اس کیلئے تاریخی شہادتیں پیش کی گئی ہیں۔

(۳) جزیرہ نمائے ہند کو کسی معنی میں ایک ملک قرار نہیں دیا جا سکتا نسل، زبان، روایات، مذہب، مسائل معاش وغیرہ میں مختلف حصص کے مابین سخت، بنیادی اختلافات ہیں۔ جو مٹائے نہیں جا سکتے۔

(۴) سارے جزیرہ نما کو ایک مرکز کے ماتحت رکھنے کا نتیجہ سخت قسم

کی ثقافتی، اور معاشی کشمکش کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

(۵) تاریخی حیثیت سے یہ کہنا غلط ہے کہ پورا جزیرہ نما ایک ملک ہے، ایسا مصنوعی اتحاد نہ کبھی قایم رہا ہے اور نہ آیندہ رہ سکتا ہے۔

اس تجویز میں مندرجہ ذیل پانچ وفاق کے قیام کی سفارش کیگئی ہے

(۱) **انڈستان** اس میں وفاقی وحدت کے طور پر حسب ذیل علاقے شامل ہوں گے۔ پنجاب باستثنائے حصہ شرقی یعنی قسمت انبالہ، ضلع کانگڑہ، چونا اور تحصیل گڑھ شنکر، جن میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ صوبہ سندھ۔ صوبہ سرحد، بلوچستان، بھاولپور امب۔ کپور تھلہ، ویر، مالیر کوٹلہ، قلات، خان پور، سوات۔ چترال کشمیر۔ لاس بیلہ۔

رقبہ :- ۳,۹۸,۸۳۸ مربع میل

آبادی :- ۳,۳۰,۰۰,۰۰۰

مسلمان :- ۸۲ فیصد

(۲) **ہندوستان** اس میں وفاقی وحدت کے طور پر حسب ذیل علاقے ہوں گے۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ، ممالک متوسط، بہار، بشمول بعض حصہ بنگال، اڑلیسہ، آسام، مدراس، بمبئی، اور وہ ریاستیں جو دکن یا راجستان

میں واقع نہ ہو۔

رقبہ :- ۷،۴۲،۲۷۳ مربع میل

آبادی :- ۲۱،۶۰،۱۴،۵۴۱۔

مسلمان :- ۱۱ فیصد

(۳) **راجستان** راجپوتانہ اور وسطی ہند کی مختلف ریاستوں کا وفاق۔

رقبہ :- ۱،۸۰،۶۵۶ مربع میل

آبادی :- ۱،۷۸،۵۸،۵۰۲

مسلمان :- ۸٫۹ فیصد

(۴) **دکن** حیدرآباد، میسور۔ اور دوسری ریاست ہائے دکن کا وفاق۔

رقبہ :- ۱،۲۵،۰۸۶ مربع میل

آبادی :- ۲،۰۱،۵۸،۱۷۱

مسلمان :- ۸٫۹۹ فیصد

(۵) **بنگال** اس میں حسب ذیل وفاقی وحدتیں شامل ہونگی بنگال، بشمول اضلاع سلہٹ و گوالپاڑہ تریپورہ اور دوسری ریاستیں جو اس حصہ میں واقع ہیں۔

رقبہ:- ۵۹،۷۶۴ مربع میل

آبادی:- ۳،۰۱۰،۰۰۰،۰۰۰

مسلمان:- ۱ء ۶۶ فیصد

پنجاب سے قسمت انبالہ، جمنا اور تحصیل گڑھ شنکر کو الگ کر کے صوبہ دہلی سے ملا دیا جائے۔ اس کے بعد یا تو اسے علیحدہ وفاق بنا دیا جائے یا پھر اسے ہندوستان کے ہندو وفاق میں شامل ہونا چاہئیے

نظم و نسق

بقیہ بالا پانچوں وفاق بالکل خود مختار ہونگے۔ یہ اگر چاہیں تو آپس میں مشترک امور کے لئے باہمی رضامندی سے کوئی اتحاد قایم کر سکتے ہیں۔ ہر وفاق ایک گورنر جنرل، اور اس کے اجزا، گورنروں کے ماتحت ہوں گے ان مختار وفاقوں کا اتحاد جو بنے گا اس کا صدر وائسرائے ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد میں ہر وفاق ایک حدت کی حیثیت سے شریک ہو گا۔ اور اس کے اخراجات کے لئے مناسب قوم ادا کرے گا۔ یا اگر رضامند ہو تو کچھ مدات اس کی پابجائی کے لئے مرکز سے متعلق کر دیئے جا سکتے ہیں۔ جن سے یہ رقوم حاصل کر لی جائیں

آسام کے مشرقی حصہ کو ہندوستان سے ملانے کے لئے ضلع گوالپارہ میں سے ایک راہ صوبہ آسام کو دی جائے گی۔ ہندو علاقہ میں جو مسلمان رہیں گے، اُن کے لئے تبادلہ آبادی کے سوا کوئی موثر تدبیر ممکن نہیں ہے۔

تجویز سر سکندر حیات خاں

یہ تجویز اتحاد پارٹی پنجاب کی ہے، جس کے لیڈر سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب ہیں۔ یہ ایک انگریزی پمفلٹ میں "ہندستانی وفاق کا خاکہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ تجویز درحقیقت دستور ہند ۳۵ء کے حصہ وفاق کی ترمیم ہے۔ اور اس مقصد کے ماتحت ترمیم ہے کہ مجوزہ وفاق سے مسلمانوں اور ہندوستانی والیان ریاست کو جو نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے وہ بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ اس تجویز میں جزیرہ نمائے ہند کو حسب ذیل سات حلقوں میں تقسیم کئے جانے کی سفارش کی گئی ہے۔

حلقہ (۱) آسام، بنگال، ریاست ہائے بنگال، اور سکھم،
بنگال کی وسعت کو کم کرنے کے لئے ایک دو مغربی
اضلاع کو اس سے خارج کر دیا جائے

حلقہ (۲) بہار، اڑیسہ بشمول مغربی اضلاع بنگال

حلقہ (۳) صوبہ متحدہ، ریاست ہائے صوبہ متحدہ

حلقہ (۴) صوبہ مدراس، ریاست ٹراونکور، مدراس کی دوسری ریاستیں اور کورگ

حلقہ (۵) بمبئی، حیدر آباد، ریاستہائے مغربی ہند۔ ریاستہائے احاطہ بمبئی۔ میسور، سی پی کی ریاستیں۔

حلقہ (۶) ریاست ہائے راجپوتانہ، گوالیار، سنٹرل انڈیا کی ریاستیں بہار واڑیسہ کی ریاستیں، علاقہ سی پی و برار۔

حلقہ (۷) پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، کشمیر اور جیسلمیر،

ان حلقوں میں حسب ضرورت ترمیم بھی ہو سکتی ہے، ان میں سے ہر حلقہ میں ایک حلقہ واری مقننہ ہوگی۔ جس میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندے شریک ہونگے یہ نمائندے صوبہ واری مقننہ سے منتخب ہو کر آئیں گے، ریاستوں کے نمائندے اس طرح منتخب ہوں گے کہ پہلے دس سال میں ۲/۳ کو فرمان روائے ریاست نامزد کرے گا۔ اور ایک ۱/۳ کو ریاستی مقننہ کی پیش کردہ فہرست میں سے خود وہی انتخاب کریگا۔ اس کے بعد پانچ سال تک ۱/۲ نامزد اور ۱/۲ فہرست سے ۲۰ سال کے بعد ۳/۴ فہرست سے اور ۱/۴ نامزد ارکان بھیجے جائینگے۔ ریاستوں سے جو نمائندے بھیجے جائیں گے ان میں ۱/۲ مسلمان ہوں گے۔ اقلیتوں کی نمائندگی اسی اصول اور تناسب پر ہوگی جو دستور ہند ۱۹۳۵ء میں مرقوم ہے

ان ہی حلقوں سے نمائندے منتخب ہو کر مرکزی وفاق بنائیں گے اس مرکزی وفاقی مقننہ میں (۳۷۵) ارکان ہوں گے جن میں (۲۵۰)

برطانوی ہند اور (۱۲۵) ریاستوں سے منتخب کئے جائیں گے۔ مرکزی تنفیذیہ وائسرائے اور ایک مجلس وزراء پر مشتمل ہو گا۔ مجلس وزراء میں (۷) سے کم اور (۱۱) سے زیادہ ارکان نہ ہوں گے۔ وزارت میں ہر حلقہ کا کم از کم ایک نمائندہ ضرور موجود ہو گا۔ وزارت میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ⅓ ہو گی۔ ابتداً ۱۵ یا ۲۰ سال تک وائسرائے کو حق ہو گا کہ وفاقی مقننہ کے باہر سے دو وزیر مقرر کریں اور انھیں امور خارجہ و دفاع کا قلمدان سپرد کر دیں۔

مرکزی وفاق کے ماتحت، دفاع امور خارجہ، سکہ، مواصلات اور محکمۂ درآمد و برآمد ہو گا۔ باقی امور حلقہ واری مقننہ کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔

چونکہ اس تجویز میں مرکز ایک ہی ہو گا اور بہت ہی اہم اختیارات کے ساتھ ہو گا۔ اس لئے یہ تجویز اُن مقاصد کو پورا نہیں کرتی جن کیلئے اسے تیار کیا گیا ہے۔

اسد اللہ اسکیم

مندرجہ بالا تجاویز کے علاوہ ایک اور تجویز ہے جو "اسد اللہ اسکیم"

کہلاتی ہے۔ اسمین سفارش کی گئی ہے کہ شمالی ہندوستانی مسلمانوں کو دیدیا جائے۔ اور جنوبی ہند ہندؤں کو، اور وسیع پیمانہ پر تبادلہ آبادی کے ذریعہ ممکنہ قلیل ترین مدت میں ہندؤن کو جنوب میں اور مسلمانون کو شمال میں منتقل کر دیا جائے۔ اس تجویز کے بموجب ہندوستان تین ٹکڑون میں تقسیم ہو گا۔

(۱) **شمالی ہند** شہر دہلی اور اس کے اوپر کا حصہ، جس میں، پنجاب سندھ، بلوچستان، کشمیر اور صوبہ مغربی شمالی سرحد اور اس میں واقع ہونے والی ریاستیں ہوں گی۔

(۲) **وسطی و جنوبی ہند** اس میں یوپی۔ بہار، سی۔ پی، مدراس، بمبئی حیدرآباد۔ میسور۔ اور دوسری ریاستیں شامل ہونگی

(۳) **مشرقی ہند** اُس میں بنگال، آسام، اور بہار کا کچھ حصہ شامل ہو گا۔

اعتراضات

ایک بڑے دانا آدمی کا قول ہے کہ "دماغ پر سب سے کم بار ڈالنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے، جب کسی پر اعتراض کرنا مقصود ہو" گھنٹوں دنوں، مہینوں، اور برسوں کی دماغی کاوش کوئی معقول بات پیش کرنے کیلئے مہیا کرتی ہے، لیکن صرف بولنے کی قوت معقول سے معقول بات پر اعتراضات کے تیر برسا سکتی ہے۔

تحریک پاکستان کا مطلب، اس کی غرض و غایت غالباً آپ پچھلے صفحات سے اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے مسئلہ بالکل صاف ہے۔

(۱) مسلمان ایک جداگانہ تہذیب اور غیر مسلموں سے متضاد تصور حیات رکھتے ہیں۔

(۲) کسی قسم کی متحدہ قومیت ایک ایسی وحدت پیدا کئے بغیر بن نہیں سکتی جس میں جداگانہ تشخصات گم ہو کر قومی خودی پیدا نہ ہو جائے

(۳) مسلمان مسلمان رہ کر کفار کے اشتراک کیساتھ ایسی قومیت نہیں بنا سکتا۔

(۴) مسلمان کسی نسلی، وطنی اور لسانی قومیت کے ناپاک تصور سے بالاتر ہے۔ ملک میں اس کی آبادی ایک فیصد ہو یا ۹۹ فیصد وہ کبھی کسی وحدت قومی کا جزء نہیں بن سکتا، اور نہ اپنی وحدت ملی کا کسی کافر کو جزء بنا سکتا ہے

(۵) ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت ہوئی تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال کے غریب مسلمانوں پر ہندو ساہوکاروں کی معاشی دستبرد جاری رہے گی اور ان علاقوں میں ہندوؤں کو لیجا کر بسانے کی اسکیم اس وقت غیر سرکاری طور پر جاری ہے اس وقت سرکاری ہو جائے گی۔

(۶) اگر کسی قوم کو حق خود انفصالی حاصل نہ ہو تو وہ قوم غلام ہوگی۔

(۷) ہندوستان کی آزادی وخود مختاری کے بعد بھی اگر ایک مرکزی حکومت ہوئی تو اس مرکز میں مسلمانوں کی آواز بے اثر رہے گی۔ اور اُسے حق خود انفصالی حاصل نہیں ہوگا یہ صورت غلامی کی ہے۔

اس لئے ہندوستان کے مسلمان

پاکستان کا مطلب چاہتے ہیں کہ اس جزیرہ نما کو کسی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت نہ رکھا جائے۔ بلکہ ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی الگ مرکزی حکومت بنالیں، یہ مطالبہ فطری حق کا مطالبہ ہے، نہ اس سے

کسی کا حق غصب کرنا مقصود ہے، اور نہ یہ مطالبہ لعین دین کی غرض سے کیا گیا ہے۔

قائداعظم مسٹر محمد علی جناح لندن کے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو فرماتے ہیں :۔

"لاہور کی قرارداد پاکستان نہ صرف مسلم ہندوستان کا غور کردہ اور پر عزم مطالبہ بلکہ وہ ۹۹ فیصدی مسلمانان ہند کا ایمان بھی بن گیا ہے، ہم حق خودارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں اور استصواب عام کے ذریعہ واجبی آزمائش میں پڑنے کے لئے تیار اور آمادہ ہیں اس کے علاوہ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ کا واحد حل ہے، جس سے نہ صرف دونوں بڑی قومیں ہندو اور مسلمان کو امن اور خوشحالی نصیب ہو گی بلکہ ہندوستانی ریاستوں کو بھی جو ہندوستان کا ایک ثلث حصہ ہیں۔ اور آخر میں لیکن کسی سے کم نہیں برطانیہ عظمیٰ کو بھی۔"

کس قدر صاف بات ہے، اس میں کسی دوسری جماعت کا کیا نقصان ہے ؟ اور کیا ابہام ہے جو سمجھ میں نہیں آتا، لیکن اس کے باوجود اس پر اعتراضات ہوتے ہیں، اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ہم ان اعتراضات کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ان اعتراضات کی اصولی طور پر دو قسمیں کیجا سکتی ہیں۔

(۱) اپنوں کی غلط فہمیاں۔

(۲) غیروں کے خطرات

اپنون کی غلط فہمیان

یعنی وہ اعتراضات جو بعض مسلمانون کی طرف سے تحریک پاکستان پر کئے جاتے ہیں، مسلمان جو تجویز، پاکستان پر اعتراض کرتے ہیں، ان میں سے بعض وہ مخلص و درد مند حضرات ہیں جو دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان کی تجویز روبہ عمل آئے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس کیلئے کوشش عنقائے مغرب کی تلاش کے برابر ہے، وہ اسے ایک ایسا خواب سمجھتے ہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اس لئے وہ طرح طرح کی عملی دقتین پیش کرتے ہیں۔ ان حضرات کا خلوص اور جذبہ ایمانی شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور بعض وہ ہیں جو اپنی زبان سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی زبان سے باتین کرتے ہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

چہ گویمت ز مسلمان نامسلمانی، جز این کہ پور خلیل است و آذری دانہ

پور خلیل کی یہ آذری ہم سب اولاد خلیل کے لئے ذلت اور قابل غیرت ہے۔ یہ کسی طرح گوارا نہیں کیا جاسکتا کہ اس آذری کو مسلمانون کی غلط فہمیون

میں شامل کیا جائے۔ اس لئے میں نے اسے بھی "غیروں کے خطرات" میں رکھ دیا ہے،

مضمون کے اس حصہ میں صرف وہ اعتراضات لکھے جاتے ہیں جو ایسے مسلمانوں کی طرف سے منسوب ہیں جو ماشا، اللہ صاحب علم بھی ہیں اور صاحب ایمان بھی۔

۱۔ سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ:۔

"مسلمانوں پر یہ مذہبی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہونچادیں۔ لھذا وہ اپنے آپ کو منطقوں کے اندر مقید نہیں کر سکتے۔

(حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہ)

پاکستان کا یہ مفہوم کس روسیاہ نے بتایا ہے کہ مسلمان پاکستان سے باہر قدم کبھی نہ رکھیں گے۔ اگر مسلمانوں کی مرکزی حکومت کا قیام راہ تبلیغ میں حائل ہوتا تو شاید۔ عرب، بلکہ مدینہ منورہ سے باہر اسلام کا وجود بھی نہ ملتا جعفر نے خیال نہ فرمایا کہ چین میں تو مسلمانوں نے کبھی سلطنت بھی قایم نہ کی۔ وہاں اسلام کیسے پھیل گیا۔ تبلیغی ضرورت کیلئے تو پاکستان کا وجود مفید بلکہ ضروری ہے اسی جگہ آپ اقتدار حاصل کرکے اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دلا سکین گے۔ جس کے ذریعہ وہ دنیا کے لئے نمونہ بن سکین۔ اور یہیں آپ

ایسے اجتماع کے لئے دماغوں کی تربیت کر سکیں گے جسے دیکھ کر کفار کے دل اسلام کی صداقت اور راست بازی کی طرف کھچ جائیں، پاکستان کا قیام "اسلام کا پیغام" پہنچانے کی راہ کیسے بند کر دے گا؟ مدینہ منورہ میں کوفہ میں، دمشق میں، بغداد میں، قاہرہ میں، اور طہران وغیرہ میں کہیں بھی مسلمان منطقوں کے اندر مقید نہیں ہوئے۔ تو یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ لاہور یا کسی دوسری جگہ اگر آزاد حکومت مسلم اقتدار کے ماتحت قایم ہو گئی تو مسلمان وہاں مقید ہو جائیں گے۔ بلکہ آج آپ کی تبلیغ جو ناکام ہے اس کا اصلی سبب ہی یہ ہے کہ آپ کو عزت و سربلندی حاصل نہیں، ذلت و مسکنت کے لئے مسلمان ہونے والے کہاں ملتے ہیں۔ اسلامی مراکز میں مسلمانوں کی سربلندی خود ایک دلکشی کا سبب ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ

وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگ حشیش، جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

اگر یہ اعتراض مولانا کفایت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتا تو اس قدر مہمل تھا کہ طفلانہ قرار دے کر درخور اعتنا بھی نہ ہو سکتا۔ اور مولانا بھی شاید یہ غلطی سے کہہ گئے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ مولانا ایسی مہمل سی بات کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ کیا مسلمان اپنی مساجد وغیرہ غیر مسلم علاقہ میں چھوڑ دیں گے؟

(ایک مسلمان عالم)

میں نہیں جانتا کہ یہ اعتراض کس جذبہ کے ماتحت کیا گیا ہے، اگر عام

مسلمانوں کے جذبات سے مخالفت پاکستان کی اپیل کی گئی ہے تو یقیناً دانائی ہے، ورنہ اعلیٰ درجہ کی حماقت، لیگ نے مسجدوں اور خانقاہوں کو چھوڑ کر ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان چلے جانے کا مشورہ کہاں دیا ہے؟ اگر کبھی ایسا مشورہ دیا بھی جائے تو سوال یہ ہے کہ مسجدوں اور خانقاہوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جانا جرم کیوں قرار پائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام نے تو سب مسجدوں سے زیادہ متبرک مسجد "خانہ کعبہ" کو کفار کے ہاتھوں میں چھوڑ کر ہجرت فرمائی تھی۔ اور معاشی ضروریات یا امن کے لئے جب مسلمان ایک علاقے سے دوسرے علاقہ میں جاکر بس جاتے ہیں تو مسجدیں کہاں ساتھ لیجاتے ہیں۔ امتداد ایام سے شہر اور قصبات ویران ہو جاتے ہیں تو مسجدیں کہاں انسانوں کے ساتھ دوسرے مقامات پر منتقل یا قبر میں دفن کی جاتی ہیں، حیدرآباد کے گرد و نواح میں سنکڑوں ایسی مسجدیں ہیں جن کے قریب کبھی آبادی تھی مگر اب وہاں نہ بستی موجود ہیں اور نہ بستی، آبادی ختم ہوگئی یا منتقل ہوگئی اور مسجدیں ویران ہوگئیں، ایسی مسجدیں، صوبہ بہار، یوپی، سی پی، مدراس پنجاب اور بنگال ہر جگہ موجود ہیں۔ کچھ ٹوٹ چکی ہیں، اور کچھ ٹوٹ جائیں گی۔

۳ — یہ اسکیم با اختیار صوبوں کو دیسی ریاستوں کے درجہ تک پہونچا دے گی۔ (مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی)

سبحان اللہ! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ پاکستان میں ایک خانصاحبوں کا خاندان

تو ارثاً حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ اور اگر ایسا ہو سکتا تو پھر احرار ہی کو حق انتخاب دے کر ہم دہلی قلعہ کی بادشاہی کو زندہ نہ کر دیتے پھر یہ تو فرمایئے کہ دیسی ریاستوں سے آپ کو گھن کیوں آتی ہے، کیا خدانخواستہ وہاں برطانوی ہند سے زیادہ ترقی کی راہیں مسدود ہیں؛ مولانا ذرا ذمہ دارانہ انداز میں گفتگو کرنے کی مشق فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

۴۔ "اس اسکیم کی رو سے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہتے ہیں کس بیکسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے

(مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی وغیرہ)

مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اس اعتراض کو ان ہی بزرگوں کا سمجھوں جن کی طرف یہ منسوب ہے، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری جماعت کی شاطرانہ چال ہے۔ مسلم لیگ کی تجویز لاہور میں مرقوم ہے کہ:۔

"ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، کافی موثر اور قانونی تحفظات خصوصی طور پر ان کے لئے دستور حکومت میں رکھے جائیں، تاکہ ان کے مذہب، ثقافت، اور ان کے حقوق سیاسی و انتظامی اور دیگر مفادات محفوظ رہ سکیں۔ یہ سب کچھ خود انہی (مسلمانوں) کی مرضی کے مطابق ہو"

اب ان حضرات سے پوچھئے کہ کس بیکسی کی حالت میں کہاں چھوڑا

گیا، اب اگر اعتراض کا منشا، صرف یہ ہے کہ ان صوبوں سے الگ ہو کر مسلم صوبوں کا الگ مرکز کیوں بنایا گیا۔ تو عرض یہ ہے کہ اگر یہ صوبے بلکہ ملک ایران، وافغانستان اور مصر وشام بھی خدانخواستہ ہندوستان کی مرکزی حکومت سے متعلق کر دیے جائیں تو اقلیتی صوبوں کا کیا فائدہ ہوگا۔ وہ تو بہر حال اقلیت ہی میں رہیں گے۔ کیا خدانخواستہ اقلیتی صوبہ کا کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ افغانستان اور ایران میں بھی ہندو اکثریت والے مرکز کے ماتحت کر دیے جائیں، اگر دو اشخاص قید ہوں، اور ان میں سے ایک کے رہا ہونے کی کوئی صورت نکل آئے تو دوسرا رفیق اُسے روکنا گوارا کرے گا؟ بلکہ وہ تو یہ چاہے گا کہ میرا بھائی قید سے باہر نکل کر ایسی کوشش کرے کہ کسی دن مجھے بھی آزادی میسر آسکے،

پھر پاکستان کی تجویز کے مطابق جب مسلم اکثریت والے صوبہ بقیہ ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی آزاد حکومت بنالیں گے۔ تو اقلیتی صوبوں والے مسلمان آج کی بہ نسبت زیادہ قوت محسوس کریں گے۔ قریب ہی ان کا ایک مضبوط مرکز موجود ہوگا۔ اور مرکز کی مضبوطی کس قدر تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں،

اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے یہ تجویز ناقابل عمل ہے۔ بلوچستان اور سندھ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتے، پنجاب میں اتنی سکت نہیں کہ

کفالت کرے، سرحد کی حفاظت کا عظیم الشان خرچ پاکستان کیسے برداشت کرے گا۔ بنگال اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا، پنجاب کی آمدنی میں بڑا حصہ فوجی تنخواہوں کا ہے اُس سے محروم ہو جائیگا

یہ سارے مالی اعتراضات دو مفروضے پر مبنی ہیں۔"

الف:- نظم حکومت کا موجودہ انتہائی مسرفانہ طریقہ باقی رہیگا۔

ب:- ان صوبہ جات میں آمدنی کے جتنے ذرائع ہیں وہ سب کے سب صوبوں کے اختیار میں ہیں۔

یہ دونوں مفروضے غلط ہیں، الف:- اس وقت جو نظم حکومت ہے وہ باقی نہیں رکھا جائے گا۔ گورنر صاحب سے لیکر ادنی کلرک تک جو فضول خرچی کا مرض موجود ہے وہ ہی بنیادی وجہ افلاس کی، دس دس ہزار تنخواہ، اخراجات فرید سفر کے شاندار بل۔ یہ چیف سکرٹری اور انڈر سکرٹری وغیرہ کا بیجا عملہ کم کر دیا جائیگا اور کم کرنا ہی پڑے گا۔ (ب) آج کل جو خرچ پورا نہ ہونے کی شکایت ہے اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے الواب آمدنی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور یہ صوبے خصوصاً پنجاب و بنگال اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے جس قدر مرکزی حکومت سے لیتے ہیں اُس سے کئی گونہ زیادہ ان مدات کی آمدنی سے مرکزی خزانہ میں داخل کرتے ہیں۔ اس طرح اور مجموعی طور پر یہ صوبے خسارہ میں رہتے ہیں، یہی حال بلوچستان اور سندھ کا ہے۔ اس کے علاوہ

بنگال، پنجاب، بلوچستان، اور سندھ میں آمدنی بڑھانے کے اتنے امکانات موجود ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں نہیں ہیں۔ صرف "صیغہ مواصلات اور جنگی ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ تو دیکھئے کہ دس سال کے اندر ان کی مالی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ یہ محض فریب ہے کہ ان صوبوں کو اپنا بار آپ برداشت نہ کرنے کے قابل بتایا جا رہا ہے۔ ورنہ اگر واقعۃً ہندوستان کے یہ پانچ صوبے ایسے ہی مفلس اور ذرائع آمدنی سے بالکل محروم ہیں تو ہندوستان کی مرکزی حکومت کا یہ مسرفانہ خرچ۔ سرحدوں کے اخراجات۔ اور سارے ہندوستان کے سول سروس والوں کا خرچ کون برداشت کر رہا ہے، سی، پی، مدراس، بمبئی، بہار، اور یوپی کے چھ صوبے؟ حالانکہ سی پی خود مفلس بتایا جاتا ہے، اور اڑیسہ کو فقیر، مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے تفصیلی موازنے اس وقت میرے سامنے ہیں اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ اعداد و شمار کی تھکا دینے والی تفصیلات سے آپ اکتا جائیں گے تو بتاتا کہ یہ کس قدر غلط اعتراض ہے۔ پنجاب، سرحد اور سندھ وغیرہ کو اقتصادی خطرہ ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت بنائی جانے میں ہے، الگ وفاق بنانے میں تو اس کا صحیح اقتصادی فائدہ ہے۔ پنجاب کے ایک سابق فینانشل کمشنر[1] (H. Calvert) کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے آپ ان خطرات کا اندازہ لگا سکیں گے

جو مالی حیثیت سے مرکز کے ساتھ وابستگی نے پنجاب کے لئے پیدا کر دیئے ہیں. اپنی مشہور تصنیف "پنجاب کی دولت و فراعت" The Weat and welfare of the Punjab میں لکھتے ہیں۔

"آل انڈیا فیڈریشن کا جزو بننے سے پنجاب پر اقتصادی موت طاری ہو جائے گی، اور اس کی تمام تر ذمہ داری اُن لوگون پر عائد ہو گی جو غیر پنجابی ہون گے مگر مرکز پر ان کا قبضہ ہو گا۔ وہ مرکز کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے پنجاب کا خون شیر مادر کی طرح پی جائینگے۔ وفاقی دستور کے تحت پیداوار دولت کے اہم وسائل دوسروں کے ہاتھ میں ہوں گے۔ ریلوے، ڈاک، تار بری، دبحری، ذرائع حمل و نقل تمام کے تمام صوبائی خودمختاری کے حلقہ اختیار سے باہر ہوں گے حتیٰ کے پنجاب کی پیداوار کیلئے منڈیاں تلاش کرنا۔ اس کو مناسب قیمتوں پر فروخت کرنا اور اس قسم کے دوسرے اہم کام ان کے سپرد ہوں گے۔ جنہیں پنجاب سے کوئی ہمدردی نہیں، نرخون کا تعین خارجی اثرات کے ماتحت ہو گا۔ درآمد برآمد کے سلسلہ میں پالیسی مرکز کی ہو گی۔ پنجاب کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بمبئی کے تاجروں کا وہ مہلک اثر ہے جو مرکزی حکومت سے درآمد پر محصول بڑھواتا ہے۔

"......... مرکزی حکومت اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اور بمبئی کے تاجروں کے کاروبار کو ترقی دینے کے لئے بیرونی اشیاء کی درآمد پر بھاری محصولات لگائے گی۔

اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی برآمد پر جوابًا اسی قسم کی پابندی عائد ہوگی۔ برآمد کم ہو جائے گی۔ اور چونکہ ہندوستان کی برآمد کا بیشتر حصہ خام اشیاء پر مشتمل ہے۔ جو زیادہ تر پنجاب سندھ۔ وغیرہ زرعی صوبے مہیا کرتے ہیں، اس لئے بائیکاٹ کی زد سیدھی ان صوبوں کی ۸۰ فیصدی آبادی پر پڑیگی۔"

یہ ہے ایک ایسے ماہر کی رائے جو سالہا سال کا عملی تجربہ بھی رکھتا ہے۔ اب ذرہ آپ بنوں، کوئٹہ، اور پشاور کی موجودہ صورت حال کا آج سے پچیس تیس برس کی حالت سے مقابلہ کیجئے۔ کس تیزی کے ساتھ اعلی ذات کے ہندو ساہوکار ان علاقوں میں جا کر کسانوں کا خون چوس رہے ہیں، کس طرح آبادی بڑھائی جا رہی ہے "اور اس مدت میں انہوں نے کتنا اثر پیدا کر لیا ہے۔ یہی حال کشمیر کے بدنصیب کسانوں اور پارچہ بافوں کا ہے، محنت مزدوری وہ کرتے ہیں "اور فائدہ اٹھاتے ہیں بجاج برلا، اور شنکر۔"

اس اعتراض کا ایک جزو فوجی اخراجات سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق

غرض ہے کہ سرحد کے پٹھانوں سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ فوج نہیں رکھی جاتی ہے۔ بلکہ اُن کو کچلنے اور برطانوی حکومت کے ماتحت کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی حکومت اُن سے برادرانہ برتاؤ کر کے آسانی کے ساتھ ان کا تعاون حاصل کر لے گی۔ اسے ضرورت نہیں کہ آئے دن ان بے گناہوں پر گولے برسایا کرے۔ پنجاب کو فوجی تنخواہوں کی شکل میں جو رقم ملتی ہے۔ وہ اتنی بڑی چیز نہیں جس کی تلافی جو صنعتی اور زرعی ترقی سے نہ ہو سکے۔ پھر پاکستانی حکومت بھی تو فوج رکھے گی۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں فوج رکھتی اور اخراجات برداشت کرتی ہیں۔ پاکستان کی اتنی بڑی حکومت جو آبادی اور رقبہ کے اعتبار سے ایک بہت بڑی سلطنت ہوگی۔ اس کا رقبہ اٹلی سے چار گونہ اور جرمنی سے دو گونہ ہوگا۔ یہ اخراجات کیوں نہ برداشت کر سکے گی۔ غرض یہ کہ یہ اعتراض فکر کی خامی اور مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

۶۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی مسلمانوں کا ذہنی انقلاب اس طرح پر نہ ہو سکے گا۔ کہ وہ خالص اسلامی اجتماع کی تعمیر کر سکیں۔ اگر آپ نہ کریں تو یقیناً ٹرکی جیسی آزاد حکومت میں بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ

کیلئے یہ تو ممکن ہو گا کہ تعلیمات پر نگرانی رکھیں۔ اور نئی نسل کے دماغوں کی ایسی تربیت کریں جو انھیں اسلامی انداز پر سوچنے اور سمجھنے کا اہل بنا سکے۔ ہندوستان کا جزر رہ کر تو آپ اتنا بھی نہ کر سکیں گے۔ یہ امر بھی میرے لئے قابل فہم نہیں ہے کہ میں پنجاب اور سندھ و سرحد کے مسلمانوں کو اسلام کا دشمن کیوں سمجھوں۔ اور کیوں نہ یہ باور کروں کہ وہ ایسے اجتماع کی تعمیر کے لئے کوشش کریں گے۔ میرا تجربہ ہے کہ مسلمان غلط روی کے باوجود اللہ کے قانون کو اپنے اوپر جاری کرنے کے لئے تیار۔ اور دین کے نام پر سب کچھ لٹا دینے کو آمادہ ہے۔ ڈاکٹر اشرف اور نیاز فتحپوری، جیسے مسلمان ابھی بہت کم ہیں۔ اگر آپ اپنے سوا دوسروں کو بھی مسلمان سمجھتے ہیں تو یقین رکھئے کہ ہر مسلمان کم و بیش ان ہی جذبات کا حامل ہے۔ جو آپ کے قلب میں موجزن ہیں۔

غیروں کے خطرات

یعنی وہ اعتراضات جو غیر مسلم اشخاص پاکستان کی تجویز پر کیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے اعتراضات میں عموماً یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی کثیر آبادی ہے، اس لئے

حکومت بھی ان ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہئیے۔ دوسری قومیں اگر اس سرزمین میں رہنا چاہتی ہیں۔ تو اُن کا فرض ہے کہ ہندوں کی خوشنودی حاصل کریں۔ اور اسی اصول و فلسفۂ زندگی کو اپنے لئے بھی اختیار کریں جو گاندھی جی پیش کرتے ہیں۔ مسٹر آچاریہ کرپلانی جو کامل دس سال تک آل انڈیا کانگریس کے جنرل سکرٹری رہے ہیں۔ اگسٹ ۱۹۳۹ء میں ایک بیان میں کہتے ہیں۔

"کانگریس صرف سیاسی جماعت نہیں ہے۔ سیاست کی طرح وہ معاشرت کو بھی نئی بنیادوں پر قایم کرنا چاہتی ہے، جو لوگ اس کے معاشرتی اصول نہ مانیں ان کو کانگریس میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ کانگریسی اکیموں کا قلم اور فلسفہ میں سنیں لگایا جا سکتا یہ فلسفہ زندگی دنیا کے کسی اور فلسفہ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا، ہر کانگریسی کو گاندھی جی کا فلسفہ ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۰ بجہ ۶)

آپ ہی فرمائے کہ اسے مسلمانوں، عیسائی، پارسیوں، اور سکھوں کے خلاف اعلان جنگ نہ کہا جائے تو کیا کہا جا سکتا ہے۔ اب جو اعتراضات اس قسم کے خیالات و جذبات نے ماتحت کئے جائیں، اُن کا جواب لکھنے کے لئے دل و دماغ کہاں سے لائے جائیں۔ اس سے زیادہ صاف الفاظ

میں بھائی پرمانند نے ۱۹۳۵ء کے اجلاس مہا سبھا میں فرماتے ہیں

"ہندوستان صرف ہندوؤں کا وطن ہے، مسلمان، عیسائی، اور دوسری قومیں جو ہندوستان میں آباد ہیں وہ بطور مہمان کے ہیں اور اسی وقت تک وہ یہاں رہ سکتی ہیں جب تک بطور مہمان کے رہیں۔"

اس طرح بے اختیار اور مہمان بنا کر رہنا گاندھی جی کے حسب ذیل فرمان کے بموجب کچھ تکلیف دہ بھی نہیں فرماتے ہیں۔

"میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا سے انکار کے برابر ہے۔ (ہندوستان ٹائمز، ۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء)

ظاہر ہے کہ جب دونوں متضاد نظریہ حیات رکھنے والے مذاہب نہیں تو پھر اختلاف بھی کیا ہے۔ مہمان کو درکنار گھر کے غلام بن کر رہنا بھی ناممکن نہیں۔ اب رہا یہ فیصلہ کہ دونوں کو نظریۂ حیات کے اعتبار سے مختلف و متضاد قرار دینا خدا سے انکار کے برابر ہے یا نہیں؟ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب پر چھوڑتا ہوں۔ یہی لوگ جمعیتہ العلماء کی طرف سے وعدہ کرتے ہیں۔ کہ:۔

آزاد ہندوستان میں ایک ایسا شعبہ قایم ہوگا جو مسلمانوں کے مخصوص کلچر اور نظریۂ حیات کا محافظ ہوگا اور ان سے متعلقہ احکام صرف وہی شعبہ جاری کر سکیگا۔

ہندوں کی طرف سے جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان سب میں ایک ہی بات پر زور دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کیوں نہ بن جائیں۔ اس ملاپ کی تشریح بھی گاندھی جی سے سنئے، فرماتے ہیں۔

”ہندوستان بہت بڑا ملک ہے، اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ یہ تہذیبیں اب ایک دوسری میں مدغم ہونی شروع ہو گئی ہیں۔“

(ہندوستان ٹائمز ۵ جون ۶)

بات بالکل صاف ہے، مسلمانوں سے پیشتر جتنے لوگ ہندوستان میں آئے۔ ہندوں نے ان کے ساتھ یہی کیا۔ ان کی تہذیب کو اپنے اندر مدغم کرنا شروع کیا۔ اور جب وہ جداگانہ تشخص سے محروم ہو گئے خود بخود ہندو قوم میں جذب ہو گئے، یہ عمل کس طرح غیر محسوس طریقہ پر انجام پایا۔ اس کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ گاندھی جی کا بیان جو اس کتاب کے

(ص) پر درج ہے۔

اب اگر مسلمان اس طرح ملاپ پسند نہ کریں تو ہندوستان میں ایک قوم کبھی نہ بن سکے گی بہرحال ہندوؤں کے اعتراضات سن لیجئے۔

۱۔ مسلمان بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں، مادر وطن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ (راج گوپال آچاریہ)

اچھا یہ آپ کی "مادر وطن" ٹکڑے ٹکڑے کب نہ تھی۔ اور اب کیا نہیں ہے، نیپال بھی تو آخر الگ ہے، اس "مادر وطن" کی ناک کے برابر کا حصہ ہے لیکن کٹ کر الگ ہو گیا ہے، تاریخ میں کبھی تو "مادر وطن" پوری سالم دکھی دیکھئے مضمون مندرجہ عنوان "ہندوستان کی مزعومہ وحدت تاریخ کے آئینہ میں"

۲۔ میں پوری جرات وجسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور اون کے ہمخیال حضرات۔ اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے ہیں بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔ جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔

(گاندھی جی کا مضمون مندرجہ ہندوستان ٹائمز مورخہ ۸)

مسٹر جناح اور اُن کے ہمخیال اسلام کے پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں، یا صحیح اس کے بارے میں کسی غیر مسلم کا کچھ کہنا "مہمل" ہے قابل توجہ نہیں ہو سکتا ہے مجھے معلوم ہے کہ گاندھی جی اسلامی تعلیمات اور اسلام کے پیغام کو بالکل نہیں

سمجھ سکتے انھیں چاہیئے کہ "مہاتما" بننے سے تجاوز کر کے "مفتی" اور "علامہ" بننے کی کوشش نہ فرمائیں۔

۳ - گاندھی جی نے دو طویل مضامین میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مسلمان الگ قوم نہیں ہیں۔ اور اس کے لئے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں،

(ملاحظہ ہو ہندوستان ٹائمز مورخہ (۱۴؍۴؍۴۴)

(۱) ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلموں کی اولاد ہیں اور تبدیلی مذہب سے قومیت نہیں بدل سکتی۔

(۲) ہندو اور مسلمان چونکہ ایک زبان بولتے ہیں، ایک سا لباس پہنتے ہیں، ایک جیسا کھاتے پیتے ہیں، ان میں اکثر ایک دوسرے سے پہچانے نہیں جاتے اس لئے یہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔

(۳) اسی یکسانیت کی بنا پر خدا نے انھیں، ایک قوم بنایا ہے۔ اب کوئی انسان انھیں الگ قومیں نہیں بنا سکتا۔

(۴) قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے،

(۵) ہم سب ایک ہی خدا کے عیال ہیں۔

(۶) ہندومت اور اسلام ایک ہی کلچر اور ایک ہی نظریہ حیات پیش کرتے ہیں۔

مولانا انیس الرحمن صاحب نے ایک کتاب "پاکستان" اور مسلمان" کے نام سے

لکھی ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں پہلے قوم کے لغوی معنی بتلائے گئے ہیں، پھر بتایا گیا ہے کہ مذہب کلچر میں داخل نہیں، اس کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی قوم ہیں، اس لئے اس کتاب کو گاندھی جی کے بیان کی شرح قرار دیتے ہوئے میں دونوں حضرات کا اکٹھا جواب عرض کرتا ہوں

سب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو میں لفظ قوم انگریزی لفظ Nation) کا ترجمہ ہے اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو عربی کی لغات میں لکھے ہیں، دوسرے یہ کہ اسلام نے اجتماع و قومیت کی بنیاد ان امور پر نہیں رکھی جن کا ذکر گاندھی جی نے کیا ہے، اس نے اجتماع کی بنیاد دین پر رکھی ہے۔

(ملاحظہ ہو "مسئلہ قومیت")

اب ذرا تفصیلی تنقیح کیجئے:۔

(۱) اسلامی قانون کے بموجب باپ بیٹے میں سے ایک کافر اور دوسرا مسلمان ہو تو وہ ایک دوسرے کے وارث بھی نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ دور کا نسلی اشتراک قومیت کی تعمیر کر سکے۔ پھر نومسلموں کی اولاد ہونے میں تو دنیا کے تمام مسلمان شریک ہیں یہ کچھ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ میں نسباً ھاشمی ہوں لیکن میرے چوالیسویں دادا حضرت علی رضی اللہ عنہ نومسلم تھے۔ اور اُن کے دادا تو کافر تھے۔ اسی طرح ترکی۔ مصر، شام، اور ایران و افغانستان میں

نومسلموں کی اولاد آباد ہے، گاندھی جی کو شاید خبر نہیں کہ اسلام اپنے پیروؤں کو مساوات عطا کر دیتا ہے۔ اور نسب میں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابولہب کے قریب ترین ہم نسب تھے۔

(۲) یہی معیار ہے تو پنجاب اور مدراس کو کیسے ملائیے گا۔ نہ زبان ایک نہ لباس ایک نہ غذا ایک اور نہ وضع قطع۔

(۳) خدا نے ہی مسلمانوں کو سب سے جدا ایک قوم بنایا ہے۔ وہ کسی کافر کا ہم قوم نہیں ہو سکتا۔

(۴) قرآن، گیتا، انجیل، تورات، سب کا خدا ایک ہے تو پھر یہ جھگڑا انگریزوں سے کیوں لے رکھا ہے، پھر یہ غلط ہے کہ قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے، آپ نے دونوں میں سے ایک کو بھی نہ سمجھا، ورنہ شاید ایسی غلط بات زبان سے نہ نکالتے۔

(۵) ہم سب ایک خدا کے عیال ہیں، اور انگریز کیا دوسرے خدا کے عیال ہیں۔ امریکہ اور افریقہ کے باشندوں کو بھی اس میں شریک کر لیجیے۔

(۶) ہندو مت اور اسلام متضاد نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں، ذرا غور فرمائیے۔ اور نہ سمجھ میں آئے۔ تو مولانا حسین احمد سے پوچھ لیجیے۔

۴۔ کیا پاکستان میں بھی دو قوموں کا نظریہ جاری ہوگا۔

(راج گوپال آچاریہ)

ہاں! جاری ہوگا۔ یوگوسلاویہ میں کروٹس کے ساتھ جاری ہوا یا نہیں؟ اور مصر وشام میں قبطیوں اور عیسائیوں کیساتھ جاری ہے یا نہیں۔ مسلمانوں کی ۱۴ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے ہمیشہ دو قوموں کا نظریہ جاری رکھا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ جاری رکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب ایک لامذہب نے عراقی پارلیمان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دستور حکومت سے حکومتی مذہب اسلام ہونے کی دفعہ نکال دی جائے عیسائیوں نے اس کی سخت مخالفت کی، اور کہا کہ اس طرح ہمارے حقوق صرف جنیوا کے مقرر کردہ حقوق اقلیت تک محدود ہو جائینگے۔ حالانکہ اسلام ہمیں اس سے بہت زیادہ حق ادا کرتا ہے۔ مسلمان اچھوت نہیں بنایا کرتے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک کوئی شخص اعتقاداً مسلمان نہ ہو مسلمان اسے جذب کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور اعتقاد وایمان ایسی چیز نہیں کہ جبریہ کسی پر عاید کی جائے۔

۵۔ کیا پاکستان کے مسلمان آزاد اسلامی سلطنتوں سے میل کر کے ہندوستان کیلئے خطرہ نہ بن جائینگے؟ (ڈاکٹر کمود کرجی)

یہی وہ وہمی خطرہ ہے جو سارے ہندوؤں کو لرزہ براندام کئے ہوئے ہے، حالانکہ انھیں آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھنا چاہئے۔ کہاں اور کب مسلمانوں نے اس طرح اتحاد کر کے دوسروں پر حملہ کر دیا ہے، کیا ایران اور